رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

قیمت

۸/-

[illegible]

تصانیفِ نیاز فتحپوری

[illegible]

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔

قیمت دو روپیہ (عہ۲ر)
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۳۲ افسانے ۱۹۳۳ء تک کے درج ہیں۔ زبان، قدرتِ بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگیِ خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ؍)
علاوہ محصول
خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوباتِ نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں نیز وہ جو شائع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں مع تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (عہ۲ر)
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان، اس کی تخییل، اس کی نزاکت بیان، اس کی بلندیِ مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ؍)
علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بسیط نقد و تبصرہ کیا گیا ہے مع انتخاب کلام، اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین اڈیٹر نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ۲ر علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۱۹۳۶ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہو اس میں تمام مشہور ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ؍

"نگار" جنوری ۱۹۳۷ء

(۱) "ڈرامہ اصحاب کہف" یہ ڈرامہ مصری انشاء پرداز توفیق الحکیم کی کتاب "اہل الکہف" سے ماخوذ و مقتبس ہے اور تنہا یہی ایسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشاء تمثیل کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اس نے سارہ (مشہور ایکٹرس) کو لکھے تھے اور جو دنیائے ادب و انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ وائلڈ اپنے طرز انشاء و ندرت بیان کے لحاظ سے یورپ میں جس مرتبہ کا شخص شمار ہوتا تھا اس کا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) مسئلۂ خلافت و امامت "(از نادر خیال شیعی کے قلم سے) مسئلہ خلافت و امامت لاکھ قدیم و اہم سہی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض ایسی باتوں کے نکلنے کا امکان ہے جن سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکے چنانچہ اس سلسلہ کا یہ پہلا مقالہ ہے اس کے بعض عنوان یہ ہیں:- مسئلہ خلافت کے مبادی مقدمات۔ نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے فروع و جزئیات وغیرہ ———— صفحات ۱۴۴ — قیمت عہ؍ علاوہ محصول

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بہ وجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

جلد ۳۵	فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۳۹ء	شمارہ ۴

ملاحظات	اڈیٹر	۲
انتقادیات	ل۔ احمد اکبرآبادی	۹
اندھی	شنکر سروپ بھٹناگر	۱۵
بازداری	فضل حسین تبسم	۲۷
ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات	احمد حسین	۴۱
مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں	مختارالدین احمد آرزو	۴۹
اگر جنگ چھڑ گئی تو؟	اڈیٹر	۵۶
مکتوبات نیاز	اڈیٹر	۶۲
باب الاستفسار	اڈیٹر	۶۷
کیا آپ کو معلوم ہے	اڈیٹر	۷۲
منظومات	ماہر القادری۔ شور۔ وجد۔ عدم۔ کاوش	۷۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اپریل سنہ ۳۹ء	جلد ۳۵

ملاحظات

اب کیا ہوگا

میونخ میں جو سمجھوتا ہوا تھا اس کے بعد بعض حضرات کا خیال تھا کہ وسطی یوروپ میں امن ہو جائے گا (اور اسوقت وسطی یوروپ میں امن ہو جانا گویا ساری دنیا میں امن ہو جانا ہے) لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع بہت کمزور ثابت ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس امن و سکون کے لئے مسٹر چمبرلین وزیر اعظم انگلستان نے اتنی بڑی قربانی پیش کی جو ایک لحاظ سے "قربانی مسیح" پر بھی تفوق و امتیاز رکھتی ہے۔ یعنی ایک طرف انھوں نے برطانوی اقتدار کو خاک میں ملا دیا اور دوسری طرف اپنے دیرینہ حلیف فرانس کی ساکھ مٹا کر اسے دوسرے درجہ کی حکومت کی سطح پر کھینچ لائے۔ لیکن امن و سکون کی یہ "دولتِ مستعجل" بجلی کی چمک سے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی اور وسطی یوروپ پر جنگ کا مہیب دیو تا پھر انگڑائیاں لینے لگا۔

مفاہمت میونخ کے بعد جب ہٹلر کا اقتدار اس حصۂ ملک میں قایم ہو چکا جہاں جرمن اکثریت پائی جاتی ہے تو لندن ٹائمز نے نہایت اطمینان کی سانس لیتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ زیکوسلوویکیا پر جو یہ عمل جراحی ہوا ہے وہ غالباً مفید ثابت ہوگا کیونکہ جرمن عنصر علحدہ ہو جانے کی وجہ سے اب یہ جمہوریت زیادہ اطمینان کے ساتھ ترقی کر سکے گی اور اندرونی بے چینی کوئی باقی نہ رہے گی، حالانکہ ایسا ملک جس کی صنعت و حرفت پر دوسرے قابض ہو چکے ہوں، جس کی اقتصادی خوشحالی دوسرے ملک کی عنایت پر منحصر ہو گئی ہو، جو اپنی مدافعت کرنے کا اہل باقی نہ رکھا گیا ہو اور جس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا ہو جو ایک حد درجہ شکست خوردہ و مغلوب ملک کے ساتھ کیا جاتا ہے، کیا خاک زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم وہ برائے نام زندہ تھا، اس کا نام یوروپ کے نقشہ میں ایک آزاد جمہوریت کی حیثیت سے نظر آتا تھا۔ لیکن ہٹلر نے آخر کار ۱۴ مارچ کو اس کے بھی ٹکڑے کر دئے۔

آپ زیکوسلوویکیا کا نقشہ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا بالائی حصہ تو وہ ہے جہاں پایۂ تخت پراگ پایا جاتا ہے، دوسرا درمیانی حصہ سلوویکیا کا ہے اور تیسرا روتھینیا کا۔ اس سے قبل یہ تینوں حصے ایک ہی جمہوریت میں شامل تھے۔ مفاہمت میونخ کی رو سے بالائی حصہ (جہاں جرمن اکثریت ہے) ہٹلر کے اقتدار میں چلا گیا تھا لیکن حکومت بدستور زیکوسلوویکیا کی تھی، اب جرمن نے اس حصہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا ہے اور سلوویکیا کے درمیانی حصہ میں جو حکومت قایم ہوئی ہے اس کی حیثیت بالکل جرمن کالونی کی سی ہے اور یہاں کا پریسیڈنٹ ہٹلر ہی کا مقرر کیا ہوا ہے۔ رہ گیا تیسرا حصہ (روتھینیا) سو وہ مفاہمت میونخ ہی کے وقت ہنگری کا حصہ قرار پا گیا تھا اور اب تو اس نے ہٹلر کے اشارہ سے باقاعدہ اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔

الغرض وسط یوروپ کے نقشے سے زیکوسلوویکیا بالکل محو ہو چکا ہے اور اب دول یوروپ منتظر ہیں کہ دیکھئے آیندہ اقدام ہٹلر کا کیا اور کس طرف ہوتا ہے۔ وہ حضرات جنھوں نے میونخ کی گفتگو کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ اب جرمنی قناعت کر کے بیٹھ جائے گا، سخت غلطی کی تھی۔ نازی ذہنیت بڑی حریص چیز ہے اور نازیت کا وجود ہی فتنہ و فساد پر قایم ہے۔ یہ وہ زہریلا درخت ہے کہ جب تک اس کی آبیاری انسان کے خون سے نہ کیجائے پھلتا پھولتا نہیں۔ اگر آج جرمنی کے تمام انتہائی مطالبات تسلیم کر لئے جائیں، تو کل وہ اور نئے مطالبات پیش کرے گا، ورنہ اس کی یہ تمام جنگی طیاریاں اور ان طیاریوں کے بہانے بیکار ہو جائیں گے۔

جس تدبیر سے ہٹلر نے زیکوسلوویکیا میں کامیابی حاصل کی ہے وہ اس کی نئی تدبیر نہیں ہے وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے کہ جہاں جہاں جرمن آبادی پائی جاتی ہے (خواہ وہ کم ہو یا زیادہ) وہاں نازی تحریک کا پروپگنڈا کر کے بدامنی پیدا کر دیتا ہے اور پھر اپنی قوم کی شکایات دور کرنے کا بہانہ پیدا کر کے مداخلت شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے یوروپ کا کوئی ملک اب اس خطرہ سے خالی نہیں ہے، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ریاستہائے

بلقان و بالٹک، ہر جگہ نازی تحریک کام کر رہی ہے اور جرمنی سے ہر طرح کی مدد انھیں پہونچتی ہے۔ اسکا مقصود سوائے اس کے کوئی نہیں کہ نہ صرف یوروپ بلکہ تمام دنیا سے جمہوریت کا خاتمہ کر دیا جائے اور آمریت و استبداد اسکی جگہہ لیلے لیکن جمہوری حکومت کی سب سے بڑی حامی حکومت برطانیہ کا کیا حال ہے اسکا صحیح اندازہ مسٹر ایلمر ڈیوس کے اس مقالہ سے ہوتا ہے جو نیو ریپبلک میں شایع ہوا ہے۔ مسٹر ڈیوس امریکن ہیں اور برطانیہ کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو امریکہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں، وہ زیادہ امید افزا خیالات نہیں رکھتے۔ وہ لکھتے ہیں " یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے اور برطانیہ کے درمیان " جمہوریت " کا خیال ایک غرض مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور باہمی ہمدردی و تعاون کے لئے یہ خیال کافی ہے، لیکن افسوس ہے کہ مسٹر چیمبرلین نے جو آج جمہوریت کے نام پر امریکہ کی مدد کے متوقع ہیں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ برطانیہ کے سامنے جمہوریت کے تحفظ کا کوئی سوال نہیں، بلکہ صرف ذاتی مفاد کا ہے، اور اس لئے اب گفتگو کی نوعیت یہ ہو جاتی ہے کہ امریکہ برطانیہ کے مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی مدد کرے گا یا نہیں، اور اس کا جواب شاید زیادہ امید افزا نہیں دیا جا سکتا۔

مسٹر چیمبرلین نے زیکوسلوویکیا کے باب میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصود جمہوریت کا تحفظ نہیں اور اس لئے اب (جبکہ جرمنی کی دراز دستیاں برطانوی مقبوضات کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو رہی ہیں) چیمبرلین کا جمہوری حکومتوں کو اتحاد کی دعوت دینا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔

اس طرف تو جمہوریت کے تنزل کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف نازیت کے زور و طنطنہ کو دیکھئے کہ زیکوسلوویکیا پر وہ قابض ہو گئی، میمل پر اس کا تصرف قایم ہو گیا، پولینڈ سے اس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہنگری اس کے زیر اثر ہو گیا، رومانیا میں اس کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہو گئیں، اور اسپین میں بھی وہی ہو کر رہا جو وہ چاہتی تھی۔ پھر ایسی صورت میں کھلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ اگر کسی وقت عالمگیر جنگ شروع ہوئی (اور وہ وقت دور نہیں ہے) تو جمہوری حکومتوں کے پاس کوئی اخلاقی قوت موجود نہ ہوگی اور برطانوی آبادی نے اگر لڑائی میں حصہ لیا بھی، تو وہ کسی اُصول کے تحت نہ ہوگا بلکہ صرف اس خوف کی بنا پر ہوگا کہ مبادا ہٹلر یا مسولینی کی حکومت وہاں قایم ہو جائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت مسٹر چیمبرلین نے دنیا کو جنگ کے خطرہ سے بچا لیا، لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس نے جنگ کے خطرہ کو اور زیادہ قوی کر دیا ہے اور جمہوریت کے تابوت میں، انھوں نے اپنی پالیسی سے اتنی کیلیں ٹھونک دی ہیں کہ سوائے قبرستان لیجانے کے اب اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

حیدرآباد اور آریہ سماجی تحریک

یوں تو آریہ سماجی تحریک حیدرآباد میں عرصہ سے قایم ہے اور آہستہ آہستہ مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑتی جارہی ہے، لیکن کانگرس حکومتوں کے قیام کے ساتھ پچھلے ایک سال میں اس کی توقعات بہت بڑھ گئی ہیں اور اس نے وہ اقدامات شروع کردئے ہیں جو اخلاقی، سیاسی اور مذہبی ہر حیثیت سے ناقابل درگزر ہیں۔ گو بظاہر مذہبی حیثیت سے کانگرس کو اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن قومی و اخلاقی حیثیت سے وہ اس کی تقویت کا باعث ضرور ہے اور اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ سی۔ پی کے اسپیکر ایسی حیثیت کے کانگرسی اس تحریک کی کھلی ہوئی اعانت کررہے ہیں اور مسٹر ساورکر ایسے حضرات اس کو ہندو راج کے قیام کا ذریعہ قرار دیکر، اسکی تبلیغ و اعانت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں

اس تحریک کے سلسلہ میں سب سے بڑا ناجایز فایدہ اس خیال سے اُٹھایا جارہا ہے کہ وفاقی حکومت کی کامیابی اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومتیں قایم ہوجائیں اور اسکی تائید کبھی کبھی برطانوی ارباب حل وعقد کے بیان سے ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دور جمہوریت کا ہے اور اب وہی ریاست نیکنام رہسکتی ہے جہاں ذمہ دار حکومت پائی جائے، لیکن پہلے تو ہمیں یہی سمجھنا ہے کہ ذمہ دار حکومت سے کیا مراد ہے اور یہ کہ اس کے حاصل کرنے کا کیا وہی مناسب طریقہ ہے جو حیدرآباد کے آریا سماجیوں نے اختیار کیا ہے، جبکہ فی الحقیقت آریہ سماجی جماعت آزادی نہیں بلکہ مذہبیت کی بنا پر شورش برپا کرنا چاہتی ہے۔

اُصولی بات ہے کہ کسی ملک میں ترقی یا انقلاب کی خارجی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، یعنی جب تک خود اندرونِ ملک میں اس کا احساس پیدا نہ ہو کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوسکتا، پھر اگر ہم آریہ سماجی تحریک کو جمہوریت ہی کی تحریک قرار دیں تو کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ خود حیدرآباد کی آریہ سماجی جماعت تو اس باب میں خاموش ہے اور آواز بلند ہوتی ہے، شولاپور، ناگپور، پونا اور دہلی سے!

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حیدرآباد کے ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کو توفی الحقیقت کوئی شکایت نہیں ہے لیکن برطانوی ہند کی متعصب جماعتیں یہ شورش صرف اس لئے برپا کرنا چاہتی ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست پر کیوں مسلمان خاندان حکمراں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کی آبادی ۸۵ فیصدی ہے لیکن محض کسی محکوم جماعت کی اکثریت اس کو مستلزم نہیں کہ حاکم جماعت ضرور بُری ہو۔

یہ کسی مسلمان کا کہنا نہیں بلکہ مسٹر راما راؤ اور سوامی کلجوگ نندا ایسے ذمہ دار ہندوؤں کا بیان ہے کہ

حیدرآباد کی پنچ قوموں کو (جنکی تعداد ۴۰ فی صدی ہے) جو مذہبی واقتصادی آزادی حیدرآباد میں حاصل ہے نہ برطانوی ہند میں نظر آتی ہے نہ کسی اور ریاست میں۔ اور کیا ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے یہ امر حیرتناک نہیں ہے کہ وہاں کی آریہ سماجی جماعت جس کی آبادی ۵ فی صدی نہیں ہے یہاں کی حکومت کو بدترین حکومت قرار دیتی ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال کے اندر یہاں کی ۶۵ ہزار غیر آریہ سماجی آبادی کو آریہ سماجی بنالیا گیا اس کا ثبوت نہیں کہ وہاں کی سب سے کم آبادی کو کس قدر زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے۔

اسوقت حیدرآباد میں ۲۶۰۰۰ مندر اور ۵۰۰۰ مسجدیں ہیں اور سب کو برابر برابر امداد ریاست سے ملتی ہے، کیا اس کی مثال کسی ہندو ریاست یا خود برطانوی ہند میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس وقت وہاں دس ہزار ہندو خاندان ایسے ہیں جن میں پٹواری اور پٹیل نسلاً بعد نسلٍ ہوتے چلے آرہے ہیں اور مسلمان خاندان ایسے صرف ۴ ہزار ہیں۔ پھر اگر حکومت جابر و متعصب ہوتی تو کیا اُس وراثتی روایت کو مٹا دینا دشوار تھا اور کیا آج اتنے ہندو خاندان پٹیل رہ سکتے تھے۔ علاوہ اس کے حیدرآباد میں ہندو جاگیردار بہ کثرت پائے جاتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دکن کی حکومت میں آج کیا کبھی ہندوؤں کے ساتھ تعصب نہیں برتا گیا، جاگیر کا مسئلہ حیدرآباد میں بالکل شاہانہ مرضی پر موقوف ہے اور اس میں کسی کو بھی دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آصفجاہی خاندان کے ہر حکمراں نے ہندوؤں کے ساتھ مراعات روا رکھیں اور موجودہ فرمانروا نے تو ہندوؤں کی متعدد ڈوبتی ہوئی جاگیروں کو اُن کا قرضہ خود ریاست کی طرف سے ادا کر کے فنا ہونے سے بچالیا۔ آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ ریاست کی متعدد مسجدیں اور خانقاہیں ایسی ہیں جن کے متولی ہندو ہیں اور یہ حکومت دکن کی بےتعصبی اور وسیع النظری کا اتنا بڑا ثبوت ہے جس کی مثال کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

ہندوؤں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہاں کی ملازمت میں ہندوؤں کی تعداد بہت کم پائی جاتی ہے یہ صحیح ہے لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ حکومت قصداً ایسا چاہتی ہے، بلکہ اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ دکن میں مسلمانوں کا داخلہ ہی اول اول ملازم ہونے کی حیثیت سے ہوا تھا اور ابتک ان تمام خاندانوں میں نوکری ہی کا رواج چلا آتا ہے۔ ہندو چونکہ زیادہ تر کاشت اور صنعت وحرفت پر بسر کرتے تھے، اس لئے انھوں نے خود ہی ملازمت کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ حکومت نے بھی ان کو نوکری سے باز نہیں رکھا، چنانچہ اس وقت وہاں کوئی محکمہ ایسا نہیں ہے جس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہونے کی اجازت ہندو و مسلمان دونوں کو یکساں طور پر حاصل نہ ہو۔

آریہ سماجیوں کو شکایت ہے کہ وہ مذہبی تبلیغ وہاں نہیں کر سکتے۔ اس کی تردید اس واقعہ سے ہو سکتی ہے کہ

سرزمین دکن جہاں اب سے چند سال قبل ایک آریہ بھی نہ پایا جاتا تھا آج وہاں تقریباً ستر ہزار آریہ پائے جاتے ہیں۔

حکومت نے کبھی نہ کسی کو آریہ ہونے سے باز رکھا اور نہ اسلام لانے کی ترغیب دی۔ البتہ اس نے کسی مذہبی جماعت کو سیاسی ادارہ بننے کی اجازت نہیں دی اور یہی اصل شکایت آریہ سماجیوں کی ہے جسے وہ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتے۔

جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ خود ریاست کے اندر رہنے والے ہندوؤں کو کبھی حکومت کی طرف سے شکایت پیدا نہیں ہوئی، بلکہ یہ صرف بیرونی عناصر ہیں جو وہاں ہندو مسلم سوال پیدا کر کے بدامنی پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر حیدر آباد کے مسئلہ کو ہندوؤں نے آل انڈیا مسئلہ بنا کر پیش کیا، تو مسلمانان ہند بھی اس کا جواب اسی اجتماع و اتحاد کے ساتھ دیں گے جو کسی ملک کی نو کرور آبادی میں پایا جا سکتا ہے اگر آریہ سماجی ادارے ہندوستان میں ہندو راج کا خواب دیکھ رہے ہیں تو اُن کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی یقیناً ان پر حقیقت ثابت کئے بغیر نہ رہیں گے کہ

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

بوس اور گاندھی

امسال کانگرس کی صدارت کے لئے گاندھی کی مرضی کے خلاف بوس کا دوبارہ منتخب ہو جانا بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اول تو سوشلسٹ جماعت اب اتنی کمزور نہیں رہی جتنی پہلے پائی جاتی تھی، دوسرے بوس کے خلاف جن صاحب کا نام گاندھی جی کی طرف سے پیش کیا گیا، اس میں کوئی وزن نہ تھا۔ لیکن بوس کے ساتھ گاندھی جی اینڈ کو نے جس اخلاق کا مظاہرہ اس وقت کیا ہے وہ ضرور حیرتناک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت پنت کے رزولیوشن نے جو فی الحقیقت گاندھی جی اور پٹیل ہی کا ترتیب دیا ہوا تھا، مسٹر بوس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے ہیں اور خود سوشلسٹ جماعت کے افراد نے بعد کو جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ بھی بوس کے لئے حد درجہ مایوس کن ہے، لیکن گاندھی جی کا دہلی سے الہ آباد جانا، بوس کا بستر علالت سے گاندھی جی کی ملاقات کی خواہش کا ظاہر کرنا اور اسپرینڈنٹ جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کا نہایت خشک جواب دینا، ایسا غمزدہ نارواتھا جس کی تاویل گاندھی جی کے حق میں کوئی نہیں کی جا سکتی۔

بہرحال اب صورتِ حال یہ ہے کہ بوس کی صدارت کانگرس کی گزشتہ پالیسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور گاندھی جی کا اقتدار پھر بدستور قائم ہو گیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا انتخاب ابھی تک نہیں ہوا ہے لیکن وہ بھی ہو جائے گا اور اس طرح ہو گا جس طرح گاندھی جی چاہیں گے۔

جنوری سنہ ۴۰ء کا "نگار"

نظیر کے لئے وقف ہوگا اور چونکہ نظیر اکبر آباد کا رہنے والا تھا اس لئے اس پرچہ کی ترتیب کی ذمہ داری بھی اکبرآبادہی کے ادبا پر عاید ہونی چاہئے اور ہم جناب لطیف اکبر آبادی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ خدمت اپنے سر لینا منظور کر لیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کو کون نہیں جانتا، لیکن اس کا علم کم حضرات کو ہے کہ جامعیت کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی شاعر میر سے لیکر غالب تک نظیر کا ہم پلہ نہیں۔ ممکن ہے آپ یہ سنکر حیرت کریں، لیکن جس وقت آپ جنوری ۴۰ء کا نگار پڑھیں گے تو آپ کو اس دعوے کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

ذیل میں وہ چند عنوانات پیش کئے جاتے ہیں جن پر مقالے مطلوب ہیں:-

(۱) نظیر کے حالاتِ زندگی۔ (۲) نظیر کی شاعری پر عمومی تبصرہ۔ (۳) نظیر کی غزلگوئی۔ (۴) نظیر کا فلسفۂ زندگی و نظریۂ اخلاق۔ (۵) نظیر کے ادبی احسانات۔ (۶) نظیر کے زمانہ کی زبان اور نظیر کے اجتہاداتِ لسانی۔ (۷) کلامِ نظیر میں وطنیت کا عنصر (۸) نظیر اور کبیر۔ (۹) نظیر اور میر (۱۰) نظیر کا کلام اور اس عہد کی معاشرت۔ (۱۱) نظیر کی غیر مطبوعہ تصانیف۔ (۱۲) نظیر کی فارسی دانی (۱۳) تلامذۂ نظیر۔ (۱۴) نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں۔ (۱۵) نظیر کی ہندوانہ نظمیں۔

میں ہندوستان کے تمام اربابِ قلم اور خصوصیت کے ساتھ اپنے حلقۂ احباب کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ اس باب میں وہ میری اور جناب لطیف کی پوری اعانت فرمائیں گے۔ مقالات اکتوبر تک پہونچ جانا چاہئیں۔

"نیاز"

انتقادیات

(مسلسل)

اس سہ گانہ تقسیم کی بحث سے ارسطو کے مقالے کا موجودہ حصہ حزنیہ ڈراما کی بحث کے لئے میدان طیار کرتا ہے۔ اور بحث کے اس نقطے تک پہونچ کر ارسطو (یا شاید الحاق کرنے والے) نے ایک باب کے اندر ادب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اصل شاعری سے بحث کی ہے۔ یہ بحث ضعیف، غیر محتاط اور رجح ہے اور کوئی عقلی نتیجہ اس سے نہیں نکل سکتا ہے۔ لیکن اس سے حرج یا نقصان اس لئے واقع نہیں ہوتا کہ ارسطو کی بحث اور اس کا نظریہ تو صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ شاعری واقعتاً جو کچھ بھی ہو اس کی نوعیت کیا ہے؟ اُسے سوال۔ سے کوئی واسطہ نہیں کہ شاعری وجود میں کیونکر آئی؟ لیکن بہرحال غلط فہمی پیدا ہو جانے کی اصل وجہ یہ ہوئی ہے کہ ارسطو کے مقالے میں ایک خاص باب کے اندر لفظ "نقل" "مونھ چڑھانے" کے معنی میں استعمال ہو گیا ہے (جس کا الحاقی ہونا بعید از قیاس نہیں)۔ لیکن اگر اُس کی بنا پر استدلال کیا بھی جائے تو اُس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر اس مشکوک مفہوم "نقل" کو نقطۂ بحث بنایا جائے اور اُس کی صحت مان لی جائے تو اُس مقالے کی باقی تمام بحث ناقابل فہم ہو جائے گی۔

اس نفسِ واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پورے مقالے میں لفظ "نقل" کا جو مفہوم ہے وہ اُس مفہوم سے مختلف ہے جو اُس خاص باب کے اندر استعمال ہوا ہے۔ ان وجوہ کے ہوتے ہوئے ارسطو کے نظرئے کو سمجھنے کی خاطر ہمیں اس خاص باب کو بالکل نظر انداز کر دینا پڑے گا۔

فلسفۂ جمالیات کا موسس اول ارسطو ہے اور یہ واقعی عجیب بات ہے کہ جمالیات کی یہ ابتداء ایسی معین اور اتنے صحیح طریق پر ہوئی کہ ارسطو کا یہ مقالۂ اولین اس موضوع پر آج تک آخرین لفظ بنا ہوا ہے

ایک عام تجربے کی بات ہے کہ جب کوئی جدید علم مرتب ہوتا ہے تو مروجہ زبان ہی سے اُس علم کی اصطلاحات اختیار کر لی جاتی ہیں اور ایسے الفاظ کا مفہوم اُس وقت غیر معین ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا بڑا امکان ہے کہ لفظ "نقل" کا جو مفہوم ہم لے رہے ہیں، ارسطو نے اُس کی یہ تعریف دانستہ نہ کی ہو۔ یعنی مفہوم کا یہ پہلو اُس کے سامنے نہ رہا ہو

ارسطو کے سامنے ایک عندیہ یا خیال موجود تھا اور ایک لفظ بھی تھا کہ اپنی بحث میں وہ اُسے استعمال کر سکے، چنانچہ جس طرح اُسے مناسب نظر آیا اُس نے اُس کا استعمال کیا۔ لیکن چونکہ نوعیت شاعری کے متعلق ارسطو کا ادراک بہت نازک تھا اس لئے اُس کے ادراک نے اس بحث کے اندر لفظ "نقل" کا موزوں و صحیح ترین استعمال کرا دیا، اور شعر و شاعری سے متعلق اس لفظ کا یہی ایک استعمال قابل فہم ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ اس لفظ کے اس استعمال ہی سے ارسطو ٹکنیک اور الہام کے درمیان امتیاز قایم کر سکا ہے اس لئے یہ استعمال نظریۂ ادب میں ناقابل قدر اضافے کا سبب ہوا۔

اتنی گفتگو کے بعد اب ارسطو کے اصل موضوع یعنے "حزنیہ" کو سمجھنا مناسب ہوگا۔ رزمیہ اور ڈرامائی کے اختلاف کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ارسطو ایک نکتہ کہہ گیا ہے جو غیر معمولی طور پر مقبول ہو، حالانکہ وہ نکتہ اتنا اہم نہ تھا رزمیہ اور ڈراما میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ ڈراما کے مقابلے میں رزمیہ نظم بہت زیادہ طویل ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ڈراما ایک تماشے (Performance) میں مکمل طور پر پیش ہو جانا چاہیئے، لیکن ایک رزمیہ میں اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ اس لئے فطری طور پر دونوں کے مضامین مختلف ہونے چاہئیں اور چونکہ ارسطو کے سامنے یونانی ڈراما تھا اس لئے اُس کی نظر میں یہ اختلاف بہت قابل توجہ تھا۔ ارسطو نے کہا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ڈراما اپنی تمثیل کو چوبیس گھنٹے کے اندر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف رزمیہ کے عمل کے واسطے کوئی پابندی نہیں ظاہر ہے کہ ارسطو کا یہ حوالہ صرف یونانی حزنیہ کے رواج سے متعلق تھا نہ کہ ڈرامائی خلقی نوعیت سے۔

یونانی حزنیہ میں سلسلہ تمثیل منقطع نہ ہوتا تھا اس لئے اس کے لئے وہی فسانہ مناسب ہوتا تھا جسکے واقعات میں تفاوتِ زمانی نمایاں نہ ہو اور بُعدِ مکانی بھی نہ ہو۔ لیکن چونکہ حزنیہ کا رقص و غنا (Chorus) اس تسلسل کو قطع کر دیتا تھا، اس لئے مصنف کو وقفۂ زمانی اور تبدلِ مکانی کا موقعہ مل جاتا تھا۔

یونان کے حزنیہ نگار شعرا نے گاہ گاہ ایسی صورتِ حال سے فایدہ اُٹھایا ہے۔ یہ قول کہ حزنیہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر واقعات کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معنوی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں، تاہم تاریخ انتقاد میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، ڈراما کی سہ گانہ وحدت یعنی وحدتِ عمل، وحدتِ زمان اور وحدتِ مکان سے اب ہر شخص واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ارسطو نے ذکر نہ کیا ہوتا تو یہ قاعدہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ مگر ارسطو کے مفہوم کو غلط سمجھے جانے سے جو نتائج رونما ہوئے ان کا ذمہ دار ارسطو نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے عہد نہضت کے بعد سے، اور بالخصوص فرانس و اطالیہ میں نقادوں نے اس سہ گانہ وحدت کو ارسطو اور یونانی حزنیہ نگاروں کی سند پر ڈرامانویسی کے لئے بطور اصل اُصول ماننا شروع کر دیا۔ وحدتِ عمل کی یونانی حزنیہ میں اعلےٰ مثالیں ملتی ہیں، نیز خود ارسطو کا قول اس کی بہترین سند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے ارسطو ہی نے صاف و واضح طور پر اسے ضروری قرار

دیا ہے۔ رنگینی وحدت زمان اور وحدت مکان سو یونانی حزنیہ میں کوئی مثال ان کی ضرورت کو ثابت کرنے والی نہیں ملتی اور ارسطو کے قول کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو اُس سے بھی کوئی سند فراہم نہیں ہوتی۔ البتہ وحدتِ مکانی کے مسئلہ میں ایک جگہ ارسطو کے بیان سے استناد کیا جا سکتا ہے، مگر وہ بھی کھینچ تان کے بعد ارسطو نے اس باب میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ اُصولی نہیں ہے بلکہ "حزنیہ جو کچھ ہے" اُس پر ایک سرسری بیان حوالۂ قلم کر دیا گیا ہے اس لئے پہلے تو ہم ارسطو کی وہ تعریفِ بیان کرتے ہیں اور پھر اُس کی تشریح کا خلاصہ پیش کریں گے۔

حزنیہ کی تعریف ارسطو ذیل کے الفاظ میں کرتا ہے:۔

"کسی سنجیدہ فعل یا عمل کی نقل کا نام حزنیہ ہے، جو اپنی جگہ مکمل ہو اور اُس میں کوئی مخصوص عظمت پائی جائے اُس میں زبان وہ اختیار کی جائے جو تصنیف کے ہر جزو کے اعتبار سے انبساط آفریں ہو اور جو بیان کی شکل میں نہیں بلکہ ڈراما کی صورت میں ہو اور جو خوف و ہمدردی کے ذریعہ سے ان جذبوں کی تنزیہ (Kathar sis) کرتی ہو"

یہ لفظی ترجمہ نہیں بلکہ خلاصہ ہے، اس تعریف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی تقسیم اُس سہ گانہ تقسیم سے مماثل ہے جس سے "شعریات" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تقسیم گویا مدعا "واسطہ" اور "طریقے" سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری تقسیم حزنیہ کا مقصود بتاتی ہے۔ لیکن حزنیہ کی اس پوری تعریف میں اصل لفظ "کتارسس" ہے۔ یہ ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ ارسطو کے نزدیک حزنیہ کی صحیح فہم کے لئے اُس کے مقصود کو سمجھنا بھی اتنا ہی لازم ہے جتنا کہ اُسکی نوعیت کو اب یہاں وہ بتاتا ہے کہ حزنیہ کا مقصود "کتارسس" ہے۔ لیکن یہ "کتارسس" کیا ہے؟ اس بات کو ارسطو نے کہیں صاف نہیں کیا۔ اس لفظ کا مفہوم مبہم ہے، اور عام طور پر "صاف کرنا" یا "پاک کرنا" کے معنی میں آتا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ارسطو نے کس مفہوم میں استعمال کیا ہے اور وہ اُس پر کتنا زور دینا چاہتا ہے؟ کیونکہ یہ لفظ بہر حال استعارہ (metaphorical) ہے۔ لیکن سردست اس لفظ کے صحیح مفہوم کے مسئلہ کو ملتوی کر کے اُس کے مفہوم کے متعلق بعض ضروری تنقیحات قایم کر لینا چاہئے۔

سب سے پہلے تو نوعیتِ حزنیہ کے متعلق ارسطو کے عندیہ کا سمجھنا ضروری ہے۔ اُس کے بعد یہ جاننے کی کوشش ہونا چاہئے کہ "کتارسس" کی اصطلاح سے ارسطو نے کیا مراد لیا ہے۔ لیکن ہم اگر یہ دیکھیں کہ اس لفظ سے ارسطو نے جو مفہوم مراد لیا ہے وہ قابلِ اطمینان نہیں، تو پھر ہماری سعی یہ ہونا چاہئے، کہ ہم ارسطو کے "نوعیت حزنیہ" کے عندیے سے ایک عندیہ پیدا کریں جو اُس کے عندئے سے مماثل ہو۔ اگر ایسا ہو اور ارسطو کے "نوعیت حزنیہ" کے عندئے سے حقیقی طور پر ایک مقصود قرار پا سکے تو اُس سے حزنیہ کا جو تخیل قایم ہوگا اُسے بجا طور پر ارسطو کا "نظریۂ حزنیہ" کہا جا سکیگا اور اُس "نظریۂ حزنیہ" کی صورت مثالی (Tragic theory) "نظریۂ ادب" کی حیثیت سے ہوگی۔

اس لئے پہلے ہم کو ارسطو کی مذکورۂ بالا تعریفِ حزنیہ کی صراحت کر دینا چاہئے کہ ان شرائط سے ارسطو کی مراد کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "حزنیہ ایک فعل یا عمل کی نقل ہے"۔ یہاں فعل یا عمل سے مراد کوئی واقعہ (Event) یا واقعات کی ترتیب ہے۔ یعنی جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے"۔ لیکن اس کو فعل یا عمل سے تعبیر کرنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعہ کسی ذریعہ سے ظاہر ہو اور یہ ذریعہ بلاشبہ انسان ہی ہو سکتا ہے جس کا یہ فعل اس کا کردار کہا جائے گا۔ لہٰذا وہ فعل جس کی "نقل" "حزنیہ" ہے، واقعات کا ایک عمل ہے جو انسانی زندگی اور ارادوں میں مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن حزنیہ ایک ایسے فعل کی "نقل" ہے جو اپنی جگہ مکمل ہے اور جس میں عظمت بھی ہے۔ "اپنی جگہ مکمل" ہونے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ فعل بجائے خود ایک "کل" کی صورت لئے ہوئے ہے اور "کچھ عظمت رکھنے" کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک "کل" کی حیثیت سے تسلیم ہو سکتا ہے اور نہ اتنا مختصر ہے کہ قابلِ لحاظ نہ ہو اور نہ اتنا طویل کہ قابلِ عمل نہ ہو سکے۔ لیکن ایک "کل" یعنی مکمل ہونے کے لئے اُس فعل یا عمل کا آغاز، اُس کا وسط اور اُس کا انجام ہونا بھی ازبس ضروری ہے، اُس کے اندر ایک مخصوص لفظ (Definite Point) ایسا بھی ہونا چاہئے جس سے واقعات کا آغاز ہو اور دوسرا لفظ وہ جہاں اس کا اختتام ہو۔

"حزنیہ نقل" (Tragic Imitation) کا مقصد یہ ہے جو ابھی بیان ہوا اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ "حزنیہ نقل"، "نقلِ فطرت" نہیں ہے، کیونکہ فطری واقعات کا وقوع اس طرح نہیں ہوا کرتا۔ فطرت کے اندر کوئی شے نہ کسی معین نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نہ کسی مقرر نقطہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ فطرت میں تو ایک کامل سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ حزنیہ جس چیز کی نقل کرتی ہے وہ زندگی نہیں بلکہ زندگی کا ایک تصور ہے اور بالکل مختلف شے۔ شاعر کا نفس زندگی کے متعدد و مکانی تعلقات کو لے کر پیش کرتا ہے اور اس کا احساس ایک ایسا حتمی عندیہ بنجاتا ہے۔ جسے ہم نے اوپر کہیں "الہام" سے تعبیر کیا ہے۔ بہرحال جو "نقل" اس طرح پیش کی جائے گی وہی سچی حزنیہ ہو گی۔

شاعر کے خیال میں آنے والی پہلی چیز فعل یا عمل (Action) ہے نہ کہ پلاٹ یعنی ترتیب واقعات میں پہلے تخیلی عمل کا اظہار ہوتا ہے، پھر پلاٹ کا اور اس کی صداقت کو جانچنا آسان کام ہے اسکے لئے ہمیں بس اتنا کرنا ہے کہ ایک حزنیہ کو اسٹیج پر دیکھیں اُس کے نظارے سے ہمارے اندر جو کیفیت پیدا ہو اُس کو اُٹھا کر کے دیکھیں گے تو وہ ارسطو کی اسکیم کی ترتیب سے بالکل مطابق ہو گا۔ ارسطو کی اسکیم صناعت کا نظریۂ محض ہے۔ لیکن اُس صناعت کو سمجھنے کیلئے تھیٹر میں ہم سب سے پہلے الفاظ سنتے ہیں، پھر بولنے والے کے حسیات و خیالات سے آشنا ہوتے ہیں اور اس سے کردار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اس بحث میں زبان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ زبان ہی وہ چیز ہے جو ڈراما نویس کے ٹکنیک کے پورے سلسلہ کی حامل ہوتی ہے اس بنا پر ڈرامائی زبان حقیقی زندگی کی زبان نہیں ہو سکتی، کیونکہ حقیقی زندگی کی زبان پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو ڈراما کی زبان پر عاید ہے۔ ڈراما کے مکالمے کو غیر معمولی طور پر اظہاری

بلکہ ایک حد تک غیر فطری ہونا چاہئے۔

ارسطو اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ "پلاٹ پہلا اُصول اور صحیح طور پر حزنیہ کی جان ہے، کردار کا نمبر دوسرا ہے" یہ نظریہ اکثر ناقدوں کے اس مفروضے سے یکسر مختلف ہے کہ کردار ڈراما کا پہلا اُصول ہے۔ ارسطو کی دلیل یہ ہے کہ کردار کو کتنا ہی بہتر بنا کر پیش کیا جائے وہ اپنی ذات سے حزنیہ کبھی پیش نہیں کر سکتا اور کردار نگاری (Charac-terization) اصل میں جتنی ٹکنیک کا جزو ہے اتنی ہی اُس کی زبان کی عروضیت (Prosody) یا تشبیہات (Imagery) کی جزو ہے۔ یہ مان لینا کہ ڈراما نویس کا پہلا فرض کردار کو پیش کر دینا ہے، درست نہیں۔ کیونکہ ڈراما نقل بیشک کرتا ہے، مگر وہ زندگی کے تصور کی نقل ہوتی ہے اور کردار نگاری اس "نقل" کا ایک پہلو ہے۔ حزنیہ کی تعریف ہنوز نامکمل ہے، اور اُس میں ابھی ایک شرط کے اضافے کی اور ضرورت ہے یعنی حزنیہ جس فعل کی نقل کرتی یا اظہار کرتی ہے، اُسے سنجیدہ بھی ہونا چاہئے۔ یعنی حزنیہ کے لئے خوف وہمدردی کے جذبات کو برانگیختہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس موقعہ پر ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ارسطو کی بحث کی تہ میں فلاطون کے اعتراض کار دبھی ہے۔ کیونکہ فلاطون کا سنگین ترین اعتراض خوف وہمدردی کے جذبات اُکسانے کے مقصد پر تھا۔ فلاطون کے اعتراض میں جتنا استحکام ہے وہ شاعری کی "نقل" کو غلط طور پر سمجھنے کی بنا پر ہے، اور جب شاعرانہ نقل کی حقیقی نوعیت بیان ہو جاتی ہے تو اعتراض دفع ہو جاتا ہے۔ فلاطون کا اعتراض شاعری اور خاص کر حزنیہ پر یہ تھا کہ چونکہ اُس میں جذبات کو اُکسانے کی طاقت ہے اس لئے وہ باعتبارِ اثر بُری شے ہے۔ ارسطو نے اس سنگین الزام کا جواب اپنے اُصولِ "تنزیہہ" (کتارسس) سے دیا ہے۔ ہر چند لفظ "تنزیہہ" (کتارسس) کی صراحت ارسطو نے کہیں نہیں کی ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس عہد میں یہ لفظ اتنا عام تھا کہ ارسطو کو اُس کا مفہوم واضح کر دینے کا خیال بھی نہ آیا۔ تاہم لفظ "نقل" کا مفہوم متعین کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ لفظ "تنزیہہ" (کتارسس) کا صحیح وقطعی مفہوم معلوم کیا جائے۔

لیکن ایکبار ہمیں یہ پھر سمجھ لینا چاہئے کہ حزنیہ پر فلاطون کو کیا اعتراض تھا؟ اُس کا اعتراض یہ تھا کہ ایک حزنیہ کا ہیرو ہمارے جذبات اپنی بدنصیبیوں کا رونا رو کر برانگیختہ کرتا ہے اور اپنی مصیبتوں کا جتنا گہرا احساس کرا سکتا ہے، ہم اُس کی اتنی ہی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن واقعی زندگی میں، اس کے برعکس، ہم اُس آدمی کی داد دیتے ہیں جو اپنی تکلیفوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور برداشت کرتا رہتا ہے۔ پھر جس فعل کو ہم حقیقی زندگی میں ناروا سمجھیں، ایک ایکٹر کو اُسی فعل کے لئے داد وتحسین سے نوازیں کہاں کا انصاف ہے؟ اس کے علاوہ ہم جب اُس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اُس کے المناک جذبات سے ہمیں لطف حاصل ہوتا ہے اور غم ایک معمولی چیز بن جاتا ہے۔ ارسطو کو تسلیم ہے کہ حزنیہ کا کام جذبات کو اُبھارنا ہے جو اپنی جگہ پُر خطر بھی ہیں اور شاید ناخوشگوار بھی۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ حزنیہ جس طریق سے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے وہ ان جذبات کی تنزیہہ (کتارسس) کر دیتا ہے۔

لفظ "تنزیہہ" (کتارسس) بہر حال ایک استعارہ ہے۔ یونانی زبان میں "کتارسس" کا مفہوم مذہبی رسوم سے بھی متعلق ہے (اور اس معنی میں اُس سے "پاک کرنا" مراد ہوگا) اور اُس کے اندر طبی نظریات کا مفہوم بھی ہے (اس معنی میں اُس سے "صاف کرنا" مراد ہوگا) مگر یہ سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ خوف و ہمدردی کو "پاک صاف کرنے" سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ مگر غالباً ملٹن پہلا شخص ہے جس نے ارسطو کے مفہوم کی صحیح شرح کی ہے۔ لکھتا ہے:-

"ارسطو نے (حزنیہ کو) خوف و ہمدردی کے جذبات اُبھار کر ایسی طاقت بن جانے سے تعبیر کیا ہے جو نفس انسانی کو اُن جذبات یا اُن کی افراط سے صاف کر دیتی ہے۔ یعنی اُن جذبات کو جو حزنیہ کو پڑھنے یا عمدہ طور سے نقل کئے جانے کو دیکھ کر برانگیختہ ہو جاتے ہیں ایک مناسب اعتدال پر لے آتی ہے"۔

جہاں تک مقصود حزنیہ کا تعلق ہے، "شعریات" کا باقی کل حصہ ارسطو کی اسی تنزیہہ کے تحت ہے۔ ارسطو کی شخصیت اور اُس کی عظمت نے عہد مابعد کے نقادوں کو بھی اس طرف مایل کر دیا کہ حزنیہ ڈرامانویسی کا پرداز ارسطو کے حزنیہ کردار کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے چنانچہ (Prometheus Bound) کی حزنیہ میں ایس کیلس ([illegible]) نے ایک ایسا ہیرو پیش کیا ہے جس کے اندر نقص و عیب بھی ہیں۔ لیکن یہ حزنیہ جس خاص سبب کی بنا پر اعلیٰ ترین حزنیہ قرار پائی اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہیرو اپنے نقص اور عیب کی پاداش نہیں بلکہ اپنی خوبی و نیکی کی سزا پاتا ہے۔

ل۔ احمد اکبر آبادی

توقیت کی خریداری

تاریخ اسلامی ہند کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو چھپکر روانہ ہونا شروع ہو گئی ہے۔ اگر اسوقت تک آپ نے نہیں خریدی تو اب توجہ کیجئے۔ قیمت معہ محصول ۱۲ روپے۔ منیجر نگار

انڈھی

(مسلسل)

(۳)

(شری پلنگ پر چادر لپیٹ کر پڑ جاتی ہے۔ "آج سے میں بھی ایک تنکا نہ اُٹھا کر دوں گی"، شری بڑبڑاتی ہوئی پلنگ پر لیٹ جاتی ہے!)

"باہر سرن دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے!"

سرن:- (باہر ہی سے) شری شری!!

(شری کے کانوں میں آواز ضرور آتی ہے۔ مگر صرف چادر سے منہ نکالنے کے علاوہ دروازہ کھولنے کے لئے اُٹھتی بھی نہیں ہے! وہ اپنے کان دروازہ کی طرف لگا لیتی ہے)

شری۔ دروازہ تو کھولو۔ شری شری!!
کل تو تم نے یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے۔ کل صبح تو تم جائے بغیر مانو گی نہیں۔
شری —— شری!!
آج آخری دفعہ تو کواڑ نہ بند کرو۔ آج ایکبار تو اور کواڑ کھول دو۔
شری!
آخری مرتبہ تو تم میرے دل کو نہ توڑو۔
اگر جا رہی ہو تو لڑ کر کیوں جا رہی ہو۔ ہنسی خوشی جاؤ۔
شری!
کھولو کواڑ۔
کب تک ایسے کھڑا رہوں۔ کواڑ کھلنے کا انتظار کرتا رہوں۔
شری! شری!!
شری!!!
شری مجھے تم سے ابھی بہت کچھ کہنا ہے!

شری:- بہت کچھ سن چکی ہوں!

سرن:- اچھا تو کچھ نہ سننا۔ میں تم سے کچھ کہوں گا بھی نہیں کواڑ تو کھول دو! اندر مجھے آ جانے دو۔ رات بھر تو آرام سے سو لینے دو۔ پھر تو ساری زندگی راتیں تارے ہی گن کر کٹے گی! پھر تو زندگی بے چینی و بیقراری ہی میں گزرے گی۔ آج تو آخری رات آرام سے سو لینے دو!

شری:- جب میں یہاں سے چلی جاؤں تو گھر میں جگہ ہی جگہ ہو جاوے گی۔ خوب آرام سے سونا۔

سرن :- ہاں شری - جب تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو خوب آرام سے سوؤں گا!

(۴)

(کنتی اور سیوا کی جھونپڑی - جھونپڑی میں اندھیرا ہو گیا ہے کنتی دیوا ہاتھ میں لئے جھونپڑی میں گھستی ہے کہ اسکی ٹھوکر اس کے خاوند سیوا سے لگ جاتی ہے)

کنتی :- بیچ میں پڑ گئے ہو - دروازہ ہی پر! یہ نہ سوچا کہ باہر سے میں آؤں گی، دروازہ پر کیسے پڑ جاؤں۔

سیوا :- ہاتھ میں دیوا ہے - اتنی بڑی بڑی پرماتما نے آنکھیں دی ہیں - تب بھی تمھیں سوجھائی نہیں دیتا — آج تم نے بڑا پاپ کیا۔

کنتی :- پاپ ؟

سیوا :- ہاں !

کنتی :- کیسے ؟

سیوا :- تم اندھی ہوتیں تو تمھیں ایشور بھی معاف کر دیتا اب جب کہ تمھارے دو بڑی بڑی ہنڈا سی آنکھیں ہیں - تب تو نہ وہ معاف کر سکتا ہے اور نہ میں !!

کنتی :- کیا ہوا تو!

سیوا :- تم نے اپنے پتی کے ٹھوکر ماری !

کنتی :- بڑا پاپ کیا؟

سیوا :- تم اپنے پاپ کو مذاق میں اُڑا رہی ہو! پاپ کے اوپر پاپ - گناہ کے اوپر گناہ !!
تم اپنے گناہ کو مانو — ورنہ — ورنہ -

کنتی :- ورنہ کیا -

سیوا :- ورنہ - ایشور خیر کرے !

کنتی :- کیا خیر کرے !

سیوا :- ہماری اور تمھاری زندگی -

کنتی :- اونھ

سیوا :- برباد ہو جاوے گی !

کنتی :- تم اپنی سنجیدگی کو اپنے پاس ہی رکھا کرو -

سیوا :- میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم تم علحدہ ہوتے جا رہے ہیں -

کنتی :- ہو ہی رہے ہیں! کل میں صبح شری بی بی جی کے ساتھ جاؤں گی -

سیوا :- کہاں ؟

کنتی :- ان کے گھر -

سیوا :- گھر کیوں جا رہی ہیں !

کنتی :- سرن بابو سے ناراض ہو کر!

سیوا :- اوہ - زمانہ کیسا خراب ہے - آج کل سب عورتیں ایسی ہی ہو گئی ہیں - تم میں بھی کچھ ایسی ہی عادت آگئی ہے — تو تم کیوں ان کے ساتھ جا رہی ہو!

کنتی :- ان کو پہونچانے ؟

سیوا :- یعنی تمھیں ان دونوں کی زندگی برباد کرنے والی بنو گی! تمھیں ان دونوں کو علحدہ کرنے جا رہی ہو!

کنتی :- میں نے تو ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے اپنا ارادہ بدلا ہی نہیں - وہ تو اپنی بات پر جمی ہیں!

سیوا :- جا کیوں رہی ہیں ؟

کنتی :- اس لئے کہ ان کے ماں باپ ان کے نام اپنی زمینداری کر دیں گے !

سیوا:۔ ناراضگی کا زمینداری سے کیا تعلق! اور زمینداری کا جانے سے کیا تعلق! عجیب معمہ ہے۔ میں تو بالکل نہ سمجھ سکا۔

کنتی:۔ ناراض وہ اس لئے ہیں کہ یہاں غریبی میں زندگی کاٹنی پڑتی ہے۔ وہاں ان کے واسطے سب کچھ ہونے کی امید ہے۔ وہ اکیلی رہ سکتی ہیں!

سیوا:۔ اکیلی!!

کنتی انھیں کے منھ کے یہ لفظ ہیں!

سیوا:۔ یعنی سرن بابو سے بالکل الگ!

کنتی:۔ اور کیا

سیوا:۔ اور تو ان کو بالکل الگ کرتے جا رہی ہے۔

کنتی:۔ اب تو وہ غصہ و غرور میں اندھی ہو رہی! جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو ان کو واپس لانے کی کوشش کروں گی۔

شیوا:۔ تو جب تک وہ وہاں رہیں گی تب تک تم بھی مجھے اپنی شکل نہ دکھاؤ گی۔۔ اگر تم اس وقت ان کے ساتھ نہ جاؤ تو وہ کس کے ساتھ جاویں گی۔

کنتی:۔ تم اسوقت ان کی حالت دیکھو جاکر ان کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر میں انکے ساتھ نہ جاؤں تب بھی وہ جائے بغیر نہ مانیں گی!

سیوا:۔ اگر تم ان کو واپس نہ لائیں۔

کنتی:۔ ضرور لاؤں گی!

سیوا:۔ مجھے ڈر ہے کہ تم بھی کہیں اکیلی ہی رہنے کا ارادہ نہ کرلو! سب جانتے ہیں کہ ہمارا جیسا ہر ایک ہو جاوے اور ویسے بھی یہ تو چھوت کی بیماری ہے!

کنتی:۔ تو کیا مجھے بھی وہی بیماری لگ جائے گی۔

سیوا:۔ مجھے ڈر ہے! تم نے آج اپنے پتی کے ٹھوکر مار ہی دی۔

(۵)

(شری چادر اوڑھے پڑی ہے۔ گھنٹے کی آواز آتی ہے۔ بارہ بج گئے۔ شری نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، وہ پھر آنکھ بند کرکے لیٹ جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے۔ "کاش میں اس گھر میں نہ آتی!" ——

"اونہہ" کہکر وہ پھر کروٹ بدل لیتی ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے لبوں سے آواز آتی ہے۔ "جب میرے پاس سب کچھ ہے" —— مجھے کسی کی دولت کی ضرورت نہیں!۔ مگر ان کا پریم! وہ ایکدم پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ حیرانی سے چاروں طرف دیکھتی ہے پھر لیٹ جاتی ہے۔

دو کا گھنٹہ سنائی دیا۔ وہ ایک دم پلنگ سے اُچھل پڑی وہ چاروں طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگتی ہے۔ "کیسی آواز"۔ وہ پلنگ پر سے اُٹھ جاتی ہے اور فرش پر ٹہلنے لگتی ہے۔ کمرہ کی ایک کھڑکی کھول کر دیکھتی ہے۔ "ابھی تو اندھیرا ہے صبح نہیں ہوئی۔" پھر وہ کمرہ کی کھڑکی بند کر دیتی ہے۔ ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے! اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! وہ پھر پلنگ پر لیٹ جاتی ہے۔ نیند کا جھونکا اسے آتا ہے۔ آنکھ مِنچتی ہے کہ اسے خیال آتا ہے میں برے راستے پر جا رہی ہوں۔" دفعتہً اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

وہ ایکدم پلنگ سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن چہرہ سمجھ کر اسکا خیال ہی خیال تھا وہ کمرہ میں چاروں طرف گھومنے لگتی ہے۔ دروازہ کے کواڑوں کو چھوتی ہے۔ اس کی کنڈی دیکھتی ہے اور بیٹھ جاتی ہے وہ بار بار اپنے سر کو ہلاتی ہے۔ جیسے کہ کسی کے سر کے چاروں طرف مکھیاں بھنبھناتی ہوں اور وہ انکو اپنے سے دور رکھنے کے لئے سر ہلاتا ہو۔ وہ دروازہ کی طرف بھاگتی ہے۔ کواڑوں کو دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگتی ہے۔ ایک دم وہ چونک پڑتی ہے۔ ہوش میں آتی ہے۔ گھڑی چار کا گھنٹہ بجاتی ہے۔ شری کمرہ کی کھڑکی کو کھول کر دیکھتی ہے مشرق کی طرف ذرا ذرا سفیدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ برابر کھڑکی کے باہر ہی دیکھتی رہتی ہے!)

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(صبح کا وقت۔ ابھی پوری طور پر آفتاب طلوع بھی نہیں ہوا ہے۔ شری اپنے کمرہ میں جانے کا سامان ٹھیک کر رہی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی:- ارے بی بی جی آپ جاگ رہی ہیں!

شری:- آج میں سوئی ہی کب ہوں۔ تو سیوا سے پوچھ آئی۔

کنتی:- کیا؟

شری:- میرے ساتھ جانے کو۔

کنتی:- تو کیا ابھی تک تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔

شری:- نہیں۔

کنتی:- اب بھی بی بی جی وقت ہے!

شری:- کیسا وقت؟

کنتی:- سوچنے کا۔ سمجھنے کا۔ آگا پیچھا دیکھنے کا۔

شری:- بہت کچھ سوچ لیا۔ رات بھر تو اسی سوچ بچار میں گزار دی۔ رات بھر انہیں خیالوں نے چین نہ لینے دیا۔ لیکن اب یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے!

کنتی:- مگر اس کا انجام تو سوچ لو۔

شری:- اب کچھ نہیں سوچتی شری مجھ میں اب سوچنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ آج رات کی حالت تو میری دیکھتی دروازہ پیٹنے کے علاوہ مجھ سے اور کچھ نہ بنا اگر اسوقت دروازہ کھل جاتا تو نہ معلوم اب تک کہاں پہونچ گئی ہوتی۔ اب میں یہاں زیادہ نہ ٹھہروں گی۔ اب میں یہاں نہ رکوں گی۔ تو جا جلدی سے تیار ہو جا۔

کنتی:- مسٹر بابو کہاں ہیں!

شری:- اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرہ میں سو رہے ہوں گے!

کنتی:- تم ان سے مل آئیں!

شری:- ان کے پاس اب نہ جاؤں گی! میں کیسے جاؤں! پاؤں نہیں پڑتے (آواز بھرانے لگتی ہے) منہ نہیں پڑتا!۔ اور اب میں ان کے پاس جاؤنگی بھی نا۔ پھر ان کے سامنے جا کر ان کی باتوں کا خیال آویگا۔ ان کے حق ناحق کا خیال مجھے ستائے گا!!

کنتی:- (جاتی ہوئی) بہتر ہے۔

دوسرا سین

(ایک کمرہ جس کے ایک کونہ میں ڈیڑھ چھوٹی میز پڑی ہے میز کے اوپر کاغذوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ بہت سے کاغذ بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں۔ میز کے دو طرف الماریاں ہیں

جن میں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

سرن ان کتابوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان کتابوں پر سے نظر ہٹا کر وہ ان کاغذوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے ان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے پھر کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

سیوا کمرے کے اندر داخل ہوتا ہے۔ سرن کا سلسلۂ خیال ٹوٹ جاتا ہے ایک نظر سیوا پر ڈال کر وہ میز کی طرف جاتا ہے اور بے ترتیبی سے سارے کاغذوں کی گڈی سی بناتا ہے گڈی بناتے ہوئے اس نے سیوا سے پوچھا)

سرن :۔ کیا ہے سیوا۔

سیوا :۔ چلا آیا بابوجی آپ کو دیکھنے۔ آپ کو کسی کام کی ضرورت ہو تو مجھ سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سرن :۔ کسی کام کی ضرورت نہ پڑے گی۔ (کاغذوں کی گڈی باندھتا ہوا) اگر پڑے گی تو

سیوا :۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔

سرن :۔ ہاں، ویسے تو کنتی ہی سارا کام کر جاتی ہے!۔ تمھیں دو تین مہینے سے ایک بھی پیسہ نہ ملا ؟

سیوا :۔ میں اس کے لئے نہیں آیا ہوں بابوجی۔ آپ اس بات کی ذرا بھی فکر نہ کیجئے۔ جب آپ کے پاس ہوں گے آپ دے ہی دیں گے۔ نہیں تو آپ کی تکلیف کی فکر ہے۔"

سرن :۔ تم۔ (دور دکھی ہنسی ہنستا ہے) تم جسکے اوپر میرا کوئی حق نہیں۔ وہ میری فکر کرے! اور جس کے اوپر میرا سب کچھ حق ہے وہ اپنے مطلب کے سوا اور کچھ نہ سوچے۔ اچھا تمھارا کیسے شکریہ ادا کروں!

سیوا مجھے کوئی شکایت نہیں!

سیوا :۔ آپ اکیلے نہ رہا کیجئے بابوجی۔ اکیلے میں بُرے بُرے خیالات دماغ میں آتے ہیں۔

سرن :۔ ہاں یہی ہوتا ہے! آج ساری رات ۔

سیوا :۔ آپ سوئے نہیں ؟ ۔ آپ کی آنکھیں ۔ ۔ !

سرن :۔ کچھ نہیں سیوا! دل کی باتوں کو لبوں پر لانا زخموں پر اور نمک چھڑکنا ہے!

(بہت سے کاغذ وہ انگیٹھی میں ڈالتا ہے اور اس دیا سلائی سے آگ لگا دیتا ہے۔ کاغذ ایکدم جل اُٹھتے ہیں)

سیوا :۔ آگ کیا کر رہے ہیں بابوجی ؟

(سرن کاغذ کی گڈی کو آگ میں ڈالتے جاتا ہے)

یہ کیا کرنے جا رہے ہیں آپ ۔

سرن :۔ ایک دنیا کو جلا کر دوسری دنیا آباد کرنے!

سیوا :۔ آپ ان کو نہ جلائیے۔

سرن :۔ بغیر جلائے اب کام نہ چلے گا۔ بہت رہ لیا اس دنیا میں۔ اب دوسری دنیا میں رہنا چاہتا ہوں یہ دنیا جہاں کہ ہم تم شہری سب رہتے ہیں۔ اُجڑی ہوئی ہے اس دنیا کی خوشی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میں ان کی ذرا بھی فکر نہیں کرتا ان سے ذرا بھی پریم نہیں کرتا۔ وہ نہیں جانتیں کہ میں ان سے کتنا پریم کرتا ہوں وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ جب وہ مجھ سے جدا ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو میرے دل پہ کیا گزر جاتی ہے!۔ اب میں ان کاغذوں کو جلا کر اپنی اصلی دنیا میں رہنے لگوں گا۔

سیوا:۔ آپ ان کاغذوں کو بہت سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے!

سرن:۔ ہاں۔ ان کو دل سے لگا لگا کر رکھتا تھا۔ ان کو دل و جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ مگر اب ان کو اپنے پاس رکھنے کی کوئی امید نہیں۔ اب میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ جتنی جلد یہ میری آنکھوں کے سامنے خاک ہو جاویں، اچھا ہے!۔۔۔ تم دیکھتے تھے سیوا میں زیادہ تر اسی کمرہ میں بیٹھا رہتا تھا، یہیں، اسی کُرسی پر، اسی میز کے سہارے۔ یہیں دیواروں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ مجھ سے گفتگو کرتی ہوئی معلوم دیتی تھیں!

سیوا:۔ یہ وہی کاغذ ہیں جن میں آپ کے ۔۔۔۔

سرن:۔ ہاں میرے افسانے قلمبند ہیں!

سیوا:۔ تو آپ ان کو نیست و نابود کرنے کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کو تو ان کو دل سے لگا کر رکھنا چاہیئے تھا

سرن:۔ چاہتا تھا کہ ان کو دل سے لگا کر رکھوں۔

سیوا:۔ تو آپ ان کو جلائیے نا؟۔۔۔ میں ان کو جلانے نہ دوں گا۔

سرن:۔ نہیں بھائی۔ ان افسانوں کو اب آگ ہی میں ڈالنا ہے۔ اور آج ہی۔ ورنہ زندگی اور تلخ ہو جاوے گی!

سیوا:۔ زندگی اور تلخ ہو جاوے گی! یہ کیسے؟

سرن:۔ ہاں، ان سے اب اور زیادہ زندگی تلخ ہو جاوے گی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ دل کے بہلانے کا یہ اچھا مشغلہ ہے! شاید ان کو جلا کر میں شری کو خوش کر سکوں گا، ان میں محو رہ کر میں شری سے محبت نہیں کر سکتا!

سیوا:۔ بی بی جی سے؟

سرن:۔ میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا!

سیوا:۔ کیا۔

سرن:۔ میں نے شری کو اکیلا رہنے پر چھوڑ دیا ہے!

سیوا:۔ نہیں؟

سرن:۔ ان کو کسی کی دولت کی ضرورت نہیں!

سیوا:۔ کیا سچ ہے؟

سرن:۔ ان کے پاس ماں باپ کی زمینداری ہے!

سیوا:۔ کیا وہ ایسا خیال کرتی ہیں!

سرن:۔ ان کے اوپر میرا کوئی حق نہ رہا!

سیوا:۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا!

سرن:۔ ان کو میری ضرورت ہی نہیں رہی!

سیوا:۔ ہا!

سرن:۔ شری ایسا ہی خیال کرتی ہے۔ ان کے دل میں کل ایسے ہی خیال بھرے تھے۔

سیوا:۔ ایسا ان کو کبھی نہ سوچنا چاہئے تھا۔ ایسا سوچنا ان کے لئے پاپ ہے! گناہ ہے۔ ہائے زمانہ۔ زمانہ ہی کا کھوٹ ہے بابو جی۔ ایسی ہی ہوا ساری دنیا میں چل گئی ہے۔۔۔ وہ شاید غرور و غصہ میں اندھی ہو رہی ہیں۔

سرن:۔ اندھی!۔۔ ہاں ہوں گی، مجھے کیا معلوم۔

سیوا:۔ اندھے کو اگر ایک بار ٹھوکر لگتی ہے تو وہ گرتا ہی چلا جاتا ہے!

سرن :- کچھ دیر سوچکر۔ گرده گرنے سے بچ سکتی ہیں!

سیوا :- بچ سکتی ہیں!

سرن :- مجھے یقین ہے میں ان کو بچا سکتا ہوں!۔ ان کو راہ پر لا سکتا ہوں! ۔ میں سمجھتا ہوں وہ آجکل اپنے بس میں نہیں۔ اگر اپنے بس میں ہوتیں تو کبھی ایسا نہ کرتیں۔ تم یہیں رہنا سیوا۔

(دروازہ پر جاتا ہے)

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں۔

سرن :- (دروازہ پر سے) تم یہیں رہنا۔

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں!

سرن :- شری کے پاس جا رہا ہوں

سیوا :- وہ آپ کو نہ ملیں گی!

سرن :- کیا ابھی تک ان کے کمرہ کے دروازہ کے کواڑ بند ہیں

سیوا :- آپ کس کے پاس جا رہے ہیں۔ شری بی بی تو کبھی کی یہاں سے گئیں۔

سرن :- (کمرہ کے اندر آکر) شری گئی! شری اس طرح نہیں جا سکتی!

سیوا :- وہ کنتی کے ساتھ گئیں۔ کنتی اور وہ دونوں کبھی کی چلی گئیں۔

سرن :- شری گئی!

سیوا :- سوچ نہ کریئے۔

سرن :- مجھ سے مل کر بھی نہیں گئی! شری شری تجھے کیا ہو گیا۔

(سرن کرسی میں نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں طرف سکوت کا عالم ہے۔ باہر کمرہ کے کسی کے جوتوں کی آواز آتی ہے، سیوا باہر جھانکتا ہے۔ کسی کی آواز آتی ہے

"سرن بابو ہیں")

سرن :- کون ہے؟

سیوا :- ایک شخص آپ کو پوچھتا ہے!

سرن :- آنے دو۔

(دیال اندر آتا ہے)

دیال :- آداب عرض ہے سرن بابو۔

سرن :- آداب عرض۔ تشریف لایئے، میری کتاب کا کیا ہوا؟ اگر نہ چھپی ہو۔

دیال :- ہاں؟

سرن :- تو اسے جلا ڈالئے!

دیال :- جلا ڈالئے کیوں؟ - ایسی کتاب کیا روز روز لکھی جاتی ہے وہ تو چھاپے خانے میں پہونچ چکی ہے اور غالباً دو چار دن میں شایع ہو جائے گی۔ اس کتاب کا میں روپیہ دینے آیا ہوں!

سرن :- اب کچھ ضرورت نہیں۔

سیوا :- لے لیجئے بابو جی۔

سرن :- کس کے لئے لوں؟

سیوا :- شاید شری بی بی واپس آجاویں۔

سرن :- ان کو واپس لانے کی امید ہے؟

(روپیہ لے لیتا ہے اور رسید لکھ کر دیتا ہے)

کتنی دیر ہوئی ان دونوں کو یہاں سے گئے۔

سیوا :- قریباً تیس چالیس منٹ ہوئے ہوں گے۔

سرن :- تو کیا اسٹیشن پر میں ان کو پکڑ سکتا ہوں؟ - اچھا معاف فرمایئے دیال بابو۔ اسوقت نہایت

اہم کام سے اسٹیشن جا رہا ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔

(سرن جلدی سے کوٹ پہنتا ہے اور ننگے سر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے)

دیال :۔ کہاں گئے۔ آج ان کی عجیب حالت ہے۔

سیوا :۔ ہاں۔ کل رات سے بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں

(مکان کے اندر سے آواز آتی ہے شری ! شری !

یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ "گھر میں کوئی بھی نہیں")

دیال :۔ کاغذ کی گڈی کو دیکھ کر — یہ کیا ہے۔

سیوا :۔ سرن بابو آج اسے آگ میں جھونکنے جا رہے تھے

دیال :۔ اس کو میں لئے جاتا ہوں۔ ان سے کہدینا۔

تیسرا سین

(مکان کا صحن جس میں کئی عورتیں کھڑی ہیں)

ایک بڑھیا:۔ بھلا ایک عورت کا اپنے خاوند سے ایسا برتاؤ ہونا چاہئے۔ روپیہ پیسہ آدمی کا جنم بھر ساتھ تھوڑے ہی دیتا ہے۔ اپنے آدمی کی تو مرتے وقت تک ضرورت پڑتی ہے ! دولت کے گھمنڈ میں اپنے مالک کو چھوڑ کر جانا بڑی بدنصیبی ہے۔ اس کا آدمی تو بالکل گئو ہے !

دوسری:۔ میں بھی جب اپنے خاوند سے تنگ آجاتی ہوں تو ان سے کہدیتی ہوں کہ تمھیں ایک تنکا اُٹھا کر نہ دوں گی۔ مگر بعد کو ہاتھ ملتی ہوں کہ میں نے کیوں ان کا دل دُکھایا۔ مگر شری کا پتی تو بڑا نیک ہے۔

بڑھیا :۔ وہ شری سے ہمیشہ پریم سے بولتا تھا مگر شری کا منھ ٹیڑھا ہی رہتا تھا۔

دوسری عورت:۔ آج سرن کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔

سیوا :۔ رات بھر وہ نہیں سوئے۔ صبح میں ان کے کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ سر پر ہاتھ دھرے، کھڑکی کی طرف تاک رہے ہیں۔ جب انھوں نے میری طرف دیکھا تو انکی آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ رات بھر روتے رہے ہیں۔

بڑھیا :۔ سرن کو اب اکیلا نہ چھوڑنا۔ نہ جانے کیا دل میں آجائے

سیوا :۔ ناماجی۔ میں ان کو اکیلا نہ چھوڑوں گا !

(دروازہ سے دو آدمی اندر گھستے ہیں ان کے پیچھے معلوم ہوتا ہے کہ تین چار آدمی اور ہیں جو کسی چیز کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالتے لا رہے ہیں)

ایک آدمی:۔ ذرا دھیرے دھیرے لانا۔ چوکھٹ سے کسی کو ٹھوکر نہ لگ جاوے۔

(سب کی نگاہ ان آدمیوں کی طرف جاتی ہے وہ چارپائی پر ڈالے ہوئے سرن کو اندر لاتے ہیں اور صحن میں لٹا دیتے ہیں)

سیوا کے منھ سے نکل جاتا ہے "یہ تو سرن ہیں !"

ارے یہ کیا ہوا۔

سرن بالکل بے ہوش پڑا ہوا ہے اس کے سر سے خون جاری ہے اور سارا بدن لہو سے رنگا ہوا ہے)

ایک آدمی:۔ تم ان کے نوکر ہو ؟

سیوا :۔ ہاں۔

آدمی :۔ ان کا یہاں کوئی اور نہیں ہے۔

سیوا :- ان کی بھتیجی شری آج ہی اسی گاڑی سے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔

آدمی :- تو ان کے پاس اب کوئی نہیں!

بڑھیا :- ہم سب ہیں تو سرن کی دیکھ بھال کریں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ ہوا کیا۔

آدمی :- یہ اسٹیشن پر ریل میں کسی کو تلاش کر رہے تھے۔ ریل نے پہلی سیٹی دی تو ان کی پریشانی اور بڑھ گئی، ان کی نگاہ یکایک ایک ڈبہ پر جا پڑی۔ یہ اس کی طرف دوڑے انھوں نے ایک عورت کو کاغذ دیا۔ اور کچھ جلدی سے کہا، صرف میں نے اتنا سُنا کہ جلدی کرو۔ گاڑی چھٹنے والی ہے۔ اب تو سب کچھ ہو جاوے گا۔ تمہیں اسی کی فکر تھی۔ مگر اس عورت نے اس کاغذ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا میں نے دیکھا تو کسی بنک کا چیک تھا۔

سیوا :- پھر؟

آدمی :- یہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے ریل کو دیکھ رہے تھے۔ ریل پلیٹ فارم سے نکلنے لگی۔ جیسے ہی آخری ڈبہ نکلا انھوں نے اس کو پکڑ لیا ریل تیز ہو چکی تھی۔ اس لئے گر پڑے اور یہ حال ہو گیا!

سیوا :- (بڑھیا سے) آپ ان کے بھائی کا تو پتہ جانتی ہیں!

بڑھیا :- ہاں۔ میں ابھی اسے بلواتی ہوں!۔ تو شری کے پاس دوسری گاڑی سے جا اور اس اندھی سے کہہ کہ اپنے پتی کی حالت آ کر دیکھ لے۔

تیسرا ایکٹ

(پہلا سین)

(شیورانی، شری کی ماں جس کے سفید بال بتا رہے ہیں کہ دنیا میں وہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ ختم کر چکی ہے۔ بیٹھی ہوئی سوت کات رہی ہے اور کنکھیوں سے سب عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتی جاتی ہے۔ اس کی سنجیدہ نظر بتا رہی تھی کہ وہ لڑکیوں کے چلبلے پن سے کوسوں دور نکل گئی ہے)۔

لڑکیوں کی آواز :- کھی کھی کھی!

(بڑھیا نظر اُٹھا کر ان کی طرف دیکھتی ہے پھر اونہہ، کہکر سر جھکانے کو ہوتی ہے کہ اپنی دیورانی موہنی کو آتی ہوئی دیکھتی ہے۔ اس کی عمر چالیس برس کے قریب ہوگی)

شیورانی :- کیا شرارت مچا رکھی ہے انھوں نے؟

موہنی :- اس بچاری کو تنگ کر رکھا ہے وہ تو اس مرتبہ بڑی سیدھی بنکر آئی ہے۔ کچھ بول ہی نہیں رہی ہو

شیورانی :- ابھی ابھی آئی ہے! شرماتی ہوگی۔

(شری آتی ہے اور چپ چاپ اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

شیورانی :- تو وہاں سے کیوں چلی آئی؟

شری :- یونہی، طبیعت نہیں لگی

(دو عورتیں اور آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں شری ان کی طرف دیکھتی ہے اور اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی :- میں تلاش کر رہی تھی تمہیں!

عورت :- سرن بابو تو اچھے ہیں؟

(شری کا منھ فق ہو جاتا ہے)

کنتی :- اچھے ہی ہیں!

دوسری :- شری تو آ ہی گئی۔ کیسے آنا ہوا

شری :- ویسے ہی چلی آئی۔

موہنی :- سبوں کو دیکھنے کو دل چاہا ہوگا۔ آ گئی!

دوسری :- سرن بابو ساتھ نہیں آئے!

کنتی :- نہیں۔

(شری کانتی کا ہاتھ پکڑ کر چلی جاتی ہے۔ سہیلی بھی ان کے پیچھے ہو جاتی ہے)

دوسری :- کیوں نہیں آئے۔

کنتی :- نہیں۔ شری بی بی نے ایکدم یہاں آنے کا ارادہ کرلیا۔ وہ نہ آسکے

شیورانی :- ان کو آنا چاہئے تھا ساتھ۔

کنتی :- شری بی بی مانی ہی نہیں۔

شیورانی :- شری مانی نہیں؟ تو صاف صاف نہیں بتا رہی ہے

شری :- نہیں بی بی جی صاف تو کہہ رہی ہے۔

(شیورانی کنتی کو لیکر چلی جاتی ہے)

ایک :- کچھ دال میں کالا ضرور ہے! کنتی کہتے کہتے رک گئی!

دوسری :- نہ معلوم کیا بھید ہے۔ شری کا اس طرح سے آنا اور سرن کا ساتھ نہ آنا۔

ایک :- بڑی حیرت کی بات ہے، میں سنتی ہوں کہ شری کی سرن سے نہیں بنتی!

دوسری :- تو نہ بننے پر سرن سے الگ ہو آئی۔ ایسا کرنا تو ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ دنیا اسے کیا کہے گی؟

ایک :- ارے آجکل تو ہر ناممکن ممکن ہوگیا ہے۔ دنیا کے کہنے کی کسے پرواہ ہے!

دوسری :- اس کی شکل ہی سے مجھے شک ہو گیا تھا جب سرن کا نام آیا تو اس نے منہ پھیر لیا

ایک :- شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔

(شیورانی اور کنتی آتی ہیں)

شیورانی :- (کنتی سے) تو نے تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکال دی۔ شری نے بہت برا کیا۔ دنیا کیا کہے گی۔

کنتی :- ان کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیجئے۔ میں بھی ان کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔

(شری آتی ہے)

شری :- کیا ہے ماں۔

شیورانی :- میرے ساتھ آ۔

(شری اور شیورانی چلی جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد کنتی اور شری باتوں میں مصروف نظر آتی ہیں)

کنتی :- آج تنہائی کیوں پسند آرہی ہے!

شری :- سب اپنی اپنی باتوں میں لگی ہوئی ہیں اور ان کے ساتھ تھی تو میں!

کنتی :- ان کے ساتھ تھیں ضرور مگر ان سبھوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

شری :- تجھے وہم ہے!

کنتی :- وہم نہیں بی بی جی مجھے۔ میں تمہارے دل کی بات جان جاتی ہوں۔ میں تمھیں اس طرح نہ رہنے دونگی!

شری :- کیوں اکیلے رہنے میں کیا ہرج ہے۔

کنتی :- اکیلے رہنے میں آپ اور اداس ہوں گی!

شری :- اداس کیوں۔ اداس ہونا ہوتا تو یہاں آتی کیوں۔

کنتی :- پھر منہ پر یہ پھیکا پن کیوں ہے، ہونٹ کیوں بند ہیں، ضرور تم سوچتی رہتی ہو - میں بھانپ جاتی ہوں!

شری :- پھر وہی — کیا بھانپ لیا تو نے؟

کنتی :- تمہارے، چہرہ کے رنگ کا اُتار چڑھاؤ بتا رہا ہے کہ تم —"

شری :- کیا؟

کنتی :- کہ تم کسی اُلجھن میں پھنسی ہوئی —— کیوں ہے نا یہ بات -

شری :- نہیں! —

کنتی :- میں مان نہیں سکتی — کیا سوچ رہی ہو -

شری :- کچھ نہیں! —— وہی!

کنتی :- کیا؟

شری :- جب گاڑی چل دی تھی تو تو نے کھڑکی میں سے سر نکال کر دیکھا تھا -

کنتی :- میں نے نہیں دیکھا - میں تو اسوقت تمہیں دیکھ رہی تھی!

شری :- مجھے کیوں دیکھ رہی تھی!

کنتی :- جب تم نے ان کا کاغذ پھینک دیا تو میں تکتی کی تکتی رہ گئی -

شری :- اسوقت مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا - میرے دلمیں تو ایک طوفان مچا ہوا تھا - لیکن میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا تھا -

کنتی :- "پھر؟"

شری :- ایک آدمی کو بڑی جلدی سے ریل پر سوار ہوتے دیکھا اور وہ ایکدم گر پڑا -

کنتی :- تو کیا تم یہ شک کر رہی ہو کہ وہ سرن بابو تھے -

شری :- نہیں نہیں، یہ شک نہیں! — مگر -

(آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر شمبھوناتھ شری کے والد کی آواز آتی ہے)

آواز :- راضی سے نہیں تو زبردستی!

(شری ٹپٹاتی ہوئی وہاں سے جاتی ہے کنتی بھی اس کے پیچھے ہو لیتی ہے اور دونوں درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو جاتے ہیں)

شمبھوناتھ :- ایسا تو کرنا ہی پڑے گا - اس کو یہاں سے فوراً واپس بھیجنا پڑے گا - اس کو واپس جانا ہی چاہئے!

شیورانی :- اسے بلا کر اس سے کیا کہوں - وہ بچاری پڑی -

شمبھوناتھ :- اسے بلا کر کہو کہ یہاں سے کنتی کے ساتھ واپس چلی جائے اور کیا کہو گی ایسے وقت کچھ اور خیال نہ کرنا چاہئے اگر ذرا بھی اسے عقل ہے تو اتنا کہنے پر وہ یہاں ذرا بھی نہ رُکے گی!

(ملازم آتا ہے)

ملازم :- بابوجی! ایک آدمی آیا ہے؟

شمبھوناتھ :- کون ہے؟

ملازم :- دروازہ پر کھڑا ہے!

شمبھوناتھ :- کہدو اس سے تھوڑی دیر میں آتے ہیں!

ملازم :- میں نے اس سے کہا - یہی مگر وہ بڑی جلدی میں معلوم ہوتا ہے - بڑی گھبراہٹ میں - دو تین دفعہ تو اس نے اپنے ہاتھ سے خط گرا دیا جو اس کے پاس ہے اکھتا ہے کہ اسی وقت آپ سے

ملاقات کرنی ہے۔ اسی وقت۔ زندگی وموت کا سوال بنا تا ہے!

(شمبھوناتھ ملازم کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد شمبھوناتھ گھبرائے ہوئے آتے ہیں)

شمبھوناتھ:- ذرا اس خط کو تو سنو،

"سرن بابو ریل سے گر پڑے ہیں تمھیں کو واپس لینے کے لئے وہ چلتی ہوئی ریل پر سوار ہو رہے تھے، اب ان کی حالت اچھی نہیں ہے اگر کم سے کم انکی حالت تو دیکھ لو

تمہاری پڑوسن

مرلی"

شری اب کیا کرنا ہے؟

(سب متعجب ہو کر شری کی طرف دیکھتے ہیں)

سرن بابو کا ملازم سیتو آیا ہے — جاؤ شری!

(شری کچھ نہیں بولتی ہے اس کا رنگ یکدم کافور ہو گیا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے پیر ڈگمگاتے ہیں۔ کنتی اس کو سنبھال لیتی ہے)

کنتی:- بی بی شری!

کانتی:- ارے یہ تو بیہوش ہوئی جاتی ہے!

(سب دوڑ کر اسے سنبھال لیتے ہیں)

(باقی)

شنکر سروپ بھٹناگر

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بہ کثرت نظر آتے ہیں، لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ماہ کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے — ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی — یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر انکی چمک اور مضبوطی کو بھی قایم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے بھی نہیں آنے دیتا۔ قیمت علاوہ محصول چھوٹا بکس ۴ر، بڑا بکس ۸ر — ایک شیشی میں محصول ۶ر صرف ہوتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کیجائیں گی اتنا ہی فایدہ ہوگا — ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں — کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے۔

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

بازداری

تاریخ بازداری کا آغاز معلوم کرنا ممکن نہیں۔ مسٹر ہارٹنگ (Harting) لکھتے ہیں کہ "شکاری پرندوں کا پالنا چین میں دو ہزار سال قبل مسیح رائج تھا"۔ قوانین الصیاد[1] کے مصنف خدا یار خاں عباسی کا بیان ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا "بازدار" ایرانی فرمانروا طہمورث تھا۔ شاہ نامۂ فردوسی کے یہ اشعار اس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

رمندہ دواں راہمہ بنگرید	سیہ گوش و یوز از میاں برگزید
بچارہ بیاوردش از دشت و کوہ	بہ بند آمدند آں کہ بُد زاں گروہ
ز مرغاں ہم آنکہ بد و نیک ساز	چو باز و چو شاہین گردن فراز
بیاورد و آموختن شاں گرفت	جہانے بدو ماندہ اندر شگفت

[1] قوانین الصیاد یا جوارح نامۂ امامیہ۔ طغان تیمور خاں والیٔ خراسان (۷۳۹ھ یا ۷۵۲ھ) کے عہد میں خدا یار خاں عباسی نے تالیف کیا تھا جو شکار نامۂ ایلخانی مرتبۂ علی بن منصور کا ترجمہ ہے۔ شکار نامہ ایلخانی بصد نامۂ ملک شاہی مصنفۂ خواجہ ابو الجوارح نیشاپوری کی ترقی یافتہ صورت تھا۔

خدا یار خاں کے قول کے مطابق یہ کتاب (جوارح نامۂ امامیہ فی قوانین الصیاد) خراسان میں لکھی گئی اس وقت دلی کے تخت پر محمد تغلق متمکن تھا۔

اس کتاب کا جو نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کی زبان "ہندوستانی فارسی" ہے اور اس میں "ہندی، سندھی اور پنجابی" الفاظ اور اصطلاحات بھی بہ کثرت موجود ہیں۔

قوانین الصیاد کا یہ نسخہ جو لفٹننٹ ڈی سی فلٹ نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے ۱۹۰۸ء میں شایع کیا، یہ ان دو مخطوطوں کے باہمی مقابلہ کے بعد تیار کیا گیا تھا جن میں سے ایک ہز ہائی نس میر علی مراد بلوچ والی سندھ کی ملکیت تھا اور دوسرا نواب محمد افضل خاں کٹی خیل آف ٹانک ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قبضہ میں تھا۔

باوجود اس اہتمام اور چھان بین کے تصحیح کا حق ادا نہ ہو سکا اور اب بھی اس کا بہت سا حصہ الحاقی و جعلی ہے، کیونکہ بازنامۂ دارا شکوہ کا اقتباس (جو اس سے تین سو سال بعد کی تصنیف ہوگی) دکنی میر شکاروں کا ذکر۔ سندھی۔ پنجابی اور ہندی الفاظ کی آمیزش، اس بات کی غمازی کر رہے ہیں۔

یہاں جوارح نامہ امامیہ سے چند اقتباسات پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اس سے ایران کے اندر اس شوق کی تدریجی ترقی کی رفتار کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ لکھتا ہے:۔

"جمشید کے پاس لوگ وحوش وطیور پکڑ کرلے جاتے اور وہ ہر ایک کا نام رکھ دیتا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی نے اس فن میں یہ پہلی کتاب لکھی اسکے جانشینوں نے بھی بقدر استعداد اس فن کی ترقی میں حصہ لیا۔ چنانچہ نوشیروانِ عادل نے اس فن کو غایت کمال تک پہونچا دیا تھا۔ اس کے تمام درباری اس فن میں فرد تھے۔ حکیم بزرجمہر نے اس کے حکم کے مطابق پہلوی زبان میں "بازنامۂ نوشیروانی" مدون کیا اور یہی کتاب صدیوں تک میر شکاروں کا دستور العمل بنی رہی۔

عبدالملک بن نوح سامانی (۳۴۳ھ۔ ۳۵۰ھ) والی خراسان نے جو اس فن کا شیدائی تھا جوارح نامۂ شہنشاہی کے نام سے بازنامۂ نوشیروانی کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا۔

ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ-۴۸۵ھ) کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ شب و روز اسی دُھن میں لگا رہتا۔ سفر ہو یا حضر، شکاری جانور اس کے ہمراہ رہتے اس کے ارکانِ سلطنت کا بازداری کی صفت سے متصف ہونا ضروری تھا۔ اس کے حکم کے مطابق خواجہ نظام الملک (وزیر اعظم) کی نگرانی میں نیشاپور۔ بلخ۔ مرغز۔ مرو۔ ہرات۔ خوارزم۔ روم۔ عراق عرب۔ مصر۔ تبریز۔ اصفہان سیستان۔ ترکستان اور ہندوستان کے ماہر فن[۱] بازداروں کی کانفرنس کامل تین ہفتے ہوتی رہی جس میں اس فن کی تمام قدیم و جدید[۲] کتب فراہم کی گئی تھیں علی بن محمد نیشاپوری نے جو سرآمد بازدارانِ عصر تھا "صید نامہ ملک شاہی" اسی مؤتمر کے نتیجہ کے طور پر مدون کیا۔ طغان تیمور خاں نے اس کتاب کا آسان اور سلیس فارسی میں شکارنامہ ایلخانی کی مدد سے ترجمہ کرایا اور اپنی طرف سے بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا"[۳]

---

[۱] ان ماہران فن کے نام شہروں اور ملکوں کی ترتیب کے مطابق یہ ہیں۔ خواجہ علی بن محمد ابوالملک بلخی۔ ابوالعباس بن فضل ترمذی۔ عبداللہ بن خالد مروی۔ تاشاہ ہراتی (ہروی) علی بن عبداللہ۔ حاجی بیگ رومی۔ خواجہ زکی۔ عبدالعزیز مصری۔ خواجہ محمد تبریزی۔ خواجہ زنگی اصفہانی۔ اسمٰعیل آتال سیستانی۔ تالش ترک۔ سرداد ہندی۔ صدفتوس مغربی۔ یہ لوگ اس فن کے مختلف شعبوں کے امام تھے۔

[۲] بازنامہ جاماسپ۔ بازنامہ بقراط۔ رسالۂ جالینوس۔ بازنامہ بزرجمہر۔ جوارح نامہ ابوالبختری و دہقانِ ماکین۔ رسالہ ابوالفوارس۔ قیادرزی شکرہ نامۂ ابوالفرج بازدار۔ دہقان شکیمی۔ صیدنامۂ ابوزکریا۔ دہقان بخاری۔

[۳] اول اول بازناموں میں چند مخصوص پرندوں کا ذکر ہوتا تھا۔ عبدالملک بن نوح کے بیٹے نے بحری کی شناخت کے متعلق ایک مضمون لکھ کر ابوالبختری کے جوارح نامہ میں اضافہ کیا تھا۔ اس سے پہلے بحری کا ذکر کہیں نہ تھا۔ شاہین، شنقار اور ترقی ایران میں تاتاریوں کے ساتھ آئے تھے شکارنامۂ ایلخانی میں شکاری پرندوں کے علاوہ شیر، چیتا۔ سیاہ گوش اور کتوں کے سدھانے اور پکڑنے کے طریقے علی بن منصور نے اضافہ کئے ۔ قوانین الصیاد میں گھوڑے کی بیماریوں کا علاج۔ طوطا۔ مینا۔ بلبل، بٹیر اور کتوں کے متعلق مفید باتیں پہلے بازناموں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔

عربوں نے غالباً یہ فن ایرانیوں سے سیکھا جس کی تائید نہ صرف عربی بازناموں سے ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی کہ اس فن کی متعدد اصطلاحات عربی زبان نے فارسی سے مستعار لی ہیں۔ دو اصطلاحیں جو عربی بازناموں میں بکثرت مستعمل ہیں یہاں مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:- اول شواہین شاہین کی جمع۔ دوم گوشت بازہ (بزغالہ کی پشت کا گوشت۔)
تعلیم یافتہ پنڈتوں کا بیان ہے کہ ویدوں میں بھی جن کا زمانہ تصنیف دو ہزار سے بارہ سو قبل مسیح ہے۔ بازداری کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک لفظ "سیناجیوی" پیش کیا جاتا ہے۔ سیناجیوی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا پیشہ اور ذریعہ معاش بازداری و بازفروشی ہو۔

بقول لفٹننٹ کرنل ڈی سی فلٹ جاپان اس فن کا گہوارہ تھا۔ گو اب وہاں سے یہ فن قریب قریب مفقود ہو گیا ہے۔ فری مین اور سالون بازداری کے سلسلہ میں یورپ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

"انگلستان میں بازداری کے لئے سخت قوانین تھے جو ایڈورڈ سوم نے خاص طور پر وضع کئے تھے۔ یورپ میں اس فن سے آگ لگ رہی تھی۔ بادشاہ، امرا اور سپاہی مدہوشی کی حد تک اس کے دلدادہ تھے وہ ان مسرتوں کے حصول کے لئے اتنی کوشش کرتے تھے کہ جتنی اپنی ناموری اور شہرت کے حصول کی خاطر۔ اگر کوئی سپاہی محبوس ہو جاتا تو وہ زنداں کی دیواروں پر بازوں ہی کی تصاویر کندہ کرتا رہتا۔ کلیسا میں جاتا تو باز اس کے ہاتھ پر ہوتے۔ اگر وہ قبر میں جا لیٹتا تو بازوں کی تصاویر ہی اسکی لوح مزار بنتیں۔ عورتیں نکاح کے دن مقام مناکحت پر اور نہیں تو مینا ضرور لے جاتیں۔ خاوندوں سے محو گفتگو ہوتیں تو اس فن کی اصطلاحات بطور استعارہ استعمال کرتی تھیں۔"

اب مشرق سے بھی، جو ہمیشہ سے اس فن کا گھر رہا ہے، یہ فن مغرب کی طرح مفقود ہوتا جاتا ہے جاپان سے مفقود ہو گیا ہے، اور چین سے بھی معدوم ہو ہی چکا ہے۔ ہاں چینی باز امرتسر کے بازاروں میں کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں، جس سے اس کی چینی زندگی کا مدھم سا ثبوت مل جاتا ہے یہ شوق ایران میں دم توڑ رہا ہے اور ہندوستان میں آخری سانس لیتا معلوم دیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل صوبہ سرحد۔ سندھ اور پنجاب میں بعض شوقین موجود تھے۔ مگر اب اُن کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ضلع اٹک میں جو اس شوق کے لئے شہرۂ آفاق تھا۔ اس کے نام لیوا دو چار بزرگ باقی ہیں، ہوتی مردان میں بھی بازداری کا سامان پایا جاتا تھا، مگر اب نہیں ہے۔ اضلاع جھنگ۔ میانوالی۔ شاہ پور اور جہلم میں چند وضع دار رؤسا اس شغل میں مصروف ہیں مگر بددلی سے۔ چھچھ ہزارہ میں مرغابیوں کے شکار کے لئے ایک خاص قسم کا پرند ابھی تک پالا جاتا ہے مگر بہت کم۔ الغرض یہ آثار ظاہر کرتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد اس فن کا دُنیا کے پردے سے محو ہو جانا ضروری ہے۔

بازداری کا اثر اردو زبان پر

اگرچہ ہندوستان کے وسیع مرغزاروں کشادہ میدانوں اور شاداب جنگلوں میں پرندے بافراط ملتے ہیں اور صدیوں تک یہاں بازداری کا چرچا عام تھا۔ حتے کہ اسکولوں اور دیسی مکاتب کے طالب علم بھی شکرے اور لٹورے پالا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہ چیز یہاں یورپ کی طرح

جذباتی نہ بن سکی اور اس نے زبان کو زیادہ متاثر نہ کیا، سوداؔ کے سوا کسی اُردو شاعر نے اس فن سے کوئی خاص اثر نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری ترکی اصطلاحیں جو چغتائیوں اور مغلوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں رائج ہوئی تھیں اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ سوداؔ کی ہجویہ مثنوی کے بعض اشعار جس میں اس فن کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، ملاحظہ ہوں :-

مثنوی درِ ہجو چنچ میرزا فیضو

آہ واویلا ز دستِ روزگار
توشخانوں میں یہ غم ہے روبکار

سر سے ہر اک باز نے ٹپکی کلاہ
رخت ہر شاہین نے پہنا سیاہ

ہو گئے جُرّوں کے دل غم سے دو نیم
باشہ و شاہین و شکرے بھی یتیم

کیا ترمتی کیا آہی کیا بیسرا
یک بیک ان سے زمانہ یوں پھرا

صید اگر چاہیں کریں پدری کے تئیں
پنجوں میں اتنی بھی گیرائی نہیں

دیکھ کر دیتے ہیں اب ٹڈوں کے خیل
تیترے کے ساتھ اب کاٹتے ہیں ڈیل

پشہ کے آگے ترمتی ہے ضعیف
بھنگے کی نظروں میں دھوتی ہے خفیف

میرزا فیضو کے چنچ مر گئے
توشخانے جگ کے ویراں کر گئے

کس قدر ہے آسماں بے امتیاز
آہ کیا مارا ہے اُن نے شاہ باز

میرزا غمگیں ہوں چڑیاں شاد ہوں
گھونسلے چیلوں کے یوں آباد ہوں

دیکھ سارو کو تو کیا خرسند ہے
ڈھڈھو کو اس سے خوشی دہ چند ہے

ہائے کیا تیتر کے گھر شادی ہے آج
پنیک و غوغائی کے گھر آیا ہے راج

کبک کیا کیا مارتی ہے قہقہے
کیسے ڈھر کر رہے ہیں پپیہے،

حیف طعمہ ڈال کر وہ یوں مرے
اور ہر اک جانور خوشیاں کرے

کانپتی تھی خوف سے اس کے بٹیر
جیسے سبزک پر کیا تھا اس کو سیر

کیا کبوتر۔ کیا ٹٹیری کیا بزے
قمری اور تیتر لوے اور ابلقے

بگلے اس کے خوف سے کرتے نہ تھے
سر کو پنکھوں کے تلے دھرتے نہ تھے

قاز مک چگتے نہ تھے جنگل کے کھیت
قرقرے چگتے کبھو نکسی سے جیت

دغدغے کا کیا کلنگوں کا ہے ذکر
زندگی کا اپنی تھا سارس کو فکر

ایک دن مرزا گئے کرنے کو سیر
ہوگئی اس میں ٹک اک طعمہ کو دیر

بھوک سے جھنجھلا کے وہ غصہ میں آ
لے چلے مرزا ہی کو نیفے لگا

اب پڑی ہے کوڑی اوپر لنڈ منڈ
گرد چگتے پھرتے ہیں چڑیوں کے جھنڈ

ہائے وہ مرزا کہ جس کا سن کے نام،
آب ہو سیمرغ کا زہرہ تمام

سو کیا اس کو فلک نے یوں ذلیل
مرتے ہی جب چنچ کے بگڑا ہے یہ نیل

کووں کی ٹھونگیں ہیں اور مرزا کا سر
سارو اڑ جاتی ہے منھ پر پاد کر

اس کو مرزا گھر سے لے جاتے جدھر
لونڈی سے کہہ جاتے ہانڈی چڑھے ادھر

گھر کی بی بی سے یہ کر جاتے قرار
کون بھڑوا کھائے کچھ غیر از شکار،

اب دو پیازی قورمہ کھاتے تھے سب
میرزا بوٹی کو ترسے ہے غضب،

تھے چڑیماروں پہ مرزا جی کے گر
نصف انکے جتنے پکڑیں جانور

ہائے جس دن سے وہ یارو مر گئے
سب چڑیماروں کے سر سے گر گئے

بلکہ وہ کہتے ہیں خاص و عام میں
میرزا آئے ہمارے دام میں

لیں گے پیسے سابق اور اب حال کے
ورنہ پھنسوا دیں گے جا کتوال کے

جب نکلتے گھر سے وہ بازار کو
تیز کرتے واں چھری کی دھار کو

دیکھ کر ان کے تئیں بنئے تمام،
بند کر آنکھوں کو کہئے رام رام

اُن سے یہ کہتے اگر منظور دھرم
ہے تمھیں۔ اور دھرم کی اپنے ہو شرم

تو چھڑا دو پھٹکیوں کے جانور
جتنے ہوں پیسے انھوں کے جمع کر

بھیج دو جلدی نہ ہو ایسا کہیں،
کھولوں میں تمہارے چنچ کے تئیں

اس سخن کو جس گھڑی سنتے تھے وہ
وہ نہیں کہتے تھے کہ جو چاہو سو لو،

یہ تو بنئے کیا ہیں کئی اک روز میں
راجپوتانہ سے آئیں رشوتیں،

جیسے مرنا ہوگیا اس کا یقین،
ایک خر مہرہ کوئی دیتا نہیں،

ہائے ایسا غم نہیں اب تک ہوا   میرزا جی کا ولی نعمت موا
گھر ہوا مرزا کا سب ماتم سرا   پُرسے کو آئے ہیں یار و آشنا
کر گریباں چاک یاروں کے حضور   یوں بیاں کرتے ہیں اپنا منھ بسور
ہائے بچے چرخ جو وہ تو آپ تھے   اپنے تو یار وہ مائی باپ تھے
کھوے تھا اس کو میں جب پتوار سے   ہاتھ پر آتے تھے وہ اس ناز سے
برگِ گل جس طرح جھڑ کر باؤ سے   پنکھ پر بلبل کے آوے جا ہوئے
پھینکتا جب صید پر میں اس کو جا   اس طرح جا لاگتے کا فرادا
جس طرح معشوق لبھنے کی نگاہ   خون عاشق کا کرے ہے بے گناہ
پودنے نے یاں کے بنگالہ میں جا   ایک مینا سے کہا یہ ماجرا
پودنے سے سنتے ہی اس بات کے   اُڑ گئے مینا کے طوطے ہاتھ کے

مجھ کو بچپن سے رہا شوقِ شکار   پالا پر میں گر سے تا چرہے مار
خوب سا اُن کا کیا ہے میں نے دید   ریش پنجالوں میں اُن کے کی سفید
پر نہیں دیکھا میں ایسا جانور   ہووے چرخ اور اُڑے وہ قاز پر
تھے غرض ہر جانور پر کیا وہ شیر   گر پرندہ اس سے بچا ہے سو وہ تیر
کیا کہوں چرخ تھے یا باشین تھے   باز کے بچے تھے یا شاہین تھے
سنتے ہیں یہ درد جس دم آشنا   ان سے کہتے ہیں کہ سچ اے میرزا
واقعی یہ غم تو ہے گا ناگوار   پر خداوندی سے ہے کیا اختیار
غم میں اس کے میرزا ہرگز نہ رو   مت کہیں رو رو کے آنکھوں کو نہ کھو
گو پھنسا تھا دام میں آ کر ہما   اور پر تیرے نصیبوں میں نہ تھا
غم کو اپنے دل سے اب موقوف کر   کر دیا سودا نے قصہ مختصر

علامہ اقبالؔ مرحوم نے اپنی ملّی و فلسفیانہ اُردو فارسی نظموں میں جُرّہ۔ شاہین۔ شاہباز۔ کلاں گیر[1]۔ چنگال کافوری[2] وغیرہ کا نہایت کثرت سے استعمال کیا ہے۔

شکاری پرندے شکاری پرندوں کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ گلال چشم و سیاہ چشم۔ باز۔ باشہ اور شکرہ، گلال چشم کہلاتے ہیں اور بحری۔ چرغ۔ طغرل۔ شاہین۔ شنقار۔ زُمّج۔ لگڑ۔ ترمتی[3]۔ سنگ منگ۔ خناقہ اور عقاب وغیرہ سیاہ چشم۔

گلال چشم پرند وفادار ہوتے ہیں ایک دفعہ سدھ جانے کے بعد بہت کم بھاگتے ہیں۔ آدمیوں سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ پھر جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس وفاداری کے طفیل سیاہ چشموں کے مقابلہ میں بھاری قیمت پاتے اور عزیز سمجھے جاتے ہیں۔ باز ان سب کا بلکہ تمام شکاری پرندوں کا سرتاج گنا جاتا ہے۔

نر باز مادہ سے جُثّہ میں چھوٹا ہوتا ہے اور جُرّہ[4] کہلاتا ہے جرأت اور دلیری میں بھی یہ مادہ سے کم ہوتا ہے۔ پشاور

---

[1] "کلاں گیر" بڑے پرندوں کا شکار کرنے والا۔ [2] کافوری۔ چتا باز۔ [3] ترمتی مؤنث اور ترمتا مذکر ہے۔ اُردو میں ترمتی زیادہ استعمال ہوتا ہے اور ترمتا کم۔ باز اگرچہ مؤنث ہے مگر مذکر مستعمل ہے۔ [4] لفظ جُرّہ صرف نر باز کے لئے مستعمل ہوتا ہے دوسرے پرندوں کے لئے اس کا استعمال ناجائز ہے، مثلاً جرہ شاہین۔ جُرّہ چرغ وغیرہ نہیں کہتے۔ مگر علامہ اقبالؔ صاحب کے کلام سے اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے مثال کے طور پر سے

جرہ شاہیں بر غابِ سرا صحبت مگیر   خیز و بال و پر کشا پروازِ تو کوتاہ نیست

ممکن ہے ان کے پاس اس کی کوئی سند موجود ہو۔ مگر بازناموں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اُن کتابوں میں جُرّہ صرف نر باز کے لئے مستعمل ہے بلکہ باقی شکاری پرندوں میں نر و مادہ کی تخصیص کرتے ہی نہیں ۔!

کی جانب سے آنے والے جُرّے آج سے پندرہ بیس سال قبل سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان قیمت پاتے تھے مگر اب انکی قیمت ستر سے لیکر ایک سو روپیہ تک ہے۔ میر شکاروں کی رائے میں ایک جرہ کا ان اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔ سر بڑا۔ اعضا چھوٹے مگر موٹے۔ چونچ بڑی۔ گردن قوی۔ کانوں کے سوراخ کشادہ۔ ترش رو۔ اندک خور۔ سخت کوش۔ فراخ حوصلہ۔ فراخ چشم ایسا جرہ بہت جری ہوتا ہے

مادہ باز۔ عرف عام میں لفظ باز کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔ اسی کو شکاری پرندوں کا سردار کہا جاتا ہے اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے پرند کے علاوہ خرگوش وغیرہ کا شکار آسانی سے کر سکتا ہے۔ ایک عمدہ باز کی پہچان یہ ہے:۔ روپہلا رنگ نرم گوشت۔ بھرا ہوا جثہ۔ خوش رنگ۔ گردن لمبی۔ سر چھوٹا۔ کندھے چوڑے چکلے۔ دونوں ٹانگوں کی درمیانی جگہ کافی کشادہ۔ رانیں گوشت سے بھری اور خوب گتھی ہوئی۔ بعض ماہرین کی رائے ہے کہ اگر عمدہ باز کو دھوپ میں بٹھائیں تو وہ سورج کی طرف پشت کر لیتا ہے۔ بازداروں نے رنگوں کے لحاظ سے بھی ان کی اچھی بُری قسمیں کر دی ہیں۔ مثلاً

(۱) زرد رنگ باز۔ یہ دو رنگی باز اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ عمدہ باز ہمیشہ یک رنگ ہوگا۔ صرف وہی دو رنگ باز اچھا ہوگا جسکا عام رنگ زرد اور پشت سیاہ ہو۔ یہ بہت کمیاب ہے۔

(۲) آہو پے باز جس کی دم کے پروں پر ہرن کے پاؤں کی طرح کالے کالے پر ہوں (عام بازوں کے جن کی دم کے پروں پر کے خط چوڑے ہوتے ہیں) یہ بھی بہت کمیاب ہے۔ (۳) سبز پشت باز۔ (۴) سرخ باز۔ یہ سبز باز سے بہتر ہوتا ہے۔ چو باز جس کی دونوں رانوں پر چوڑائی کے بل ایسے خط ہوں۔ گویا ابھی ابھی کرز کر چکا ہے۔ نادر اور کمیاب ہے اسے خطنک بھی کہتے ہیں۔ (۵) کالا باز۔ (۶) سفید رنگ۔ (۷) شاہباز، ماوراءالنہر میں اسے لازقی کہتے ہیں۔ کہیں ہزاروں سال کے بعد کسی کے ہاتھ آئے تو آئے۔ بعض میر شکاروں اور ماہران فن کا خیال ہے کہ شاہباز کا رنگ مخصوص نہیں، یہ بھی دوسرے رنگ کا ہوتا ہے۔ مگر قد میں سب سے بڑا اور قوت میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو پکڑ لیں اور سدھانے میں بازدار اپنی ساری مہارت ختم کر دے جب بھی یہ رام نہیں ہوتا اس کے سر پر پروں کا خوبصورت تاج ہوتا ہے۔

باشہ۔ یہ چھوٹا سا پرند ہے، عام لوگ پالتے ہیں۔ جُرّہ اس سے کوئی چار گنا بڑا ہوتا ہے۔ چھوٹے پرندوں کا شکار کھیلنے کے لئے عجیب چیز ہے۔ ایک عمدہ باشہ میں یہ خوبیاں دیکھی جاتی ہیں۔ سر چھوٹا۔ پیٹ لمبا۔ منھ لمبوترا۔ گردن دراز پنجے خوب مُڑے ہوئے۔ اُنگلیاں چھوٹی چھوٹی۔ تلوا تنگ۔ پنڈلیاں لمبی۔ سینہ فراخ۔ کندھے چوڑے اور گدی کے پاس سے اُبھرے ہوئے۔ زبان کالی اور دُم چھوٹی۔ بالکل یہ زمین کے متوازی اُڑتا ہے اور اُڑتے وقت دُم باقی پروں سے اُلٹی ہوئی ہوتی ہے پانی کے اوپر پرواز کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ غسل کا شوقین ہے۔

شکرہ۔ ایران میں اسے پیقو کہا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت پرند جو باشہ کے لگ بھگ یا اُس سے کسی قدر چھوٹا

مگر اس کے برابر دلیر اور وفادار نہیں ہوتا۔ اس میں بھی باشہ کی ایسی صفات پائی جانی ضروری ہے۔

سیاہ چشم - ان پرندوں میں وحشت زیادہ ہوتی ہے۔ باز باشہ کے سیکھ جانے کے بعد ٹوپیاں نہیں پہنائی جاتیں مگر ان کے سر پر ہر وقت ٹوپیاں چڑھی رہتی ہیں۔ شکار پر اُڑاتے ہیں تو ٹوپی سر سے اُتار لیتے ہیں، بعد از فراغت پھر ٹوپی پہنا دی جاتی ہے۔ یہ بھی بہت دلیر ہوتے ہیں۔ باز دار انکی وفا کے باب میں ہمیشہ بدظن رہتے ہیں۔ اس گروہ میں، سے شاہین بحری اور چرغ زیادہ مشہور ہیں۔

شاہین - اس کی وجہ تسمیہ۔ بہادری اور تیز پروازی سے متعلق چند دلچسپ قصے مشہور ہیں، قوانین الصیاد کے مؤلف لکھتے ہیں:۔ جمشید کے سامنے شکاری پرندوں کو پیش کیا جا رہا تھا اور وہ ہر ایک کا مناسب نام رکھ رہا تھا۔ شاہین کو دیکھتے ہی اس کی زبان سے نکلا کر "شاہ این است"

شاہین صحیح معنوں میں شکاری پرندوں کا سردار ہے۔ ہر وہ چیز جسے بحری۔ چرغ۔ باز اور شنقار پکڑ سکتے ہیں۔ شاہین بھی اسے بآسانی شکار کر سکتا ہے۔ میر شکاروں نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔

اقسام شاہین :- اول چھوٹا جو بلند نہیں اُڑتا۔ اکثر چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً سرخ ہوتا ہے اسے اصطلاح میں "آل" کہتے ہیں، دوسری قسم سیاہ اور تیسری ابلق۔

کالے شاہین کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک زرد سر والا۔ دوسرا سر سے دُم تک سیاہ، اس میں کسی دوسرے رنگ کی مطلق آمیزش نہیں ہوتی۔ ابلق بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک سفیدی مائل۔ جس کے ابرؤوں پر سفیدی ہوتی ہے دوسرے رخش (یعنی سفید و سرخ کی آمیزش) کالا شاہین ہندوستان میں کوکلا کہلاتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام افقاز ہے یعنی یہ قفقاز سے آتا ہے، اگر کسی دوسرے مقام سے بھی ایسا شاہین پکڑا جائے تو وہ بھی افقاز ہی کہلاتا ہے۔ رخش زیادہ تیز پرواز اور جری ہوتا ہے۔ کالا شاہین مندرجہ ذیل اوصاف سے متصف ہونا چاہیے۔

سر سے دم تک سیاہ۔ سینہ کالا۔ جثہ بزرگ۔ آنکھیں فراخ۔ اندر دھنسی ہوئی۔ مُنھ کالا۔ دونوں کاندھوں کی درمیانی جگہ فراخ۔ دُم کے پر چھوٹے اور اُٹھے ہوئے۔ پنڈلی موٹی۔ رانیں گول۔ ناخن بڑے انگلیاں لانبی زبان کالی۔ زبان کی جڑ پر دو کالے خط طعمہ کھاتے وقت غضبناک ہو جانے والا۔ حریص شکار۔ گرسنگی سے بے تاب ہو جانیوالا اُڑتے ہی فوراً بلند ہو جائے۔ اگر بلائیں تو گولی کی طرح آگرے۔ بعض اوقات اس زور سے حملہ کرتا ہے کہ چھاتی زمین پر لگ کر چکنا چور ہو جاتی ہے۔

پہاڑی شاہین، جسے ہندوستانی بحری کہتے ہیں۔ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کوہی دوسرا بحری۔ بحری ان جزیروں میں انڈے بچے دیتی ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہوں۔ ابھی تک کسی شخص نے اس کا گھونسلا نہیں دیکھا۔

کوہی جو پہاڑوں پر رہتا اور انڈے بچے دیتا ہے، اس کا آشیانہ عام شکاریوں نے دیکھا ہے۔ بحری بہت غصہ ناک ہوتی ہے۔ جب یہ جزیرہ سے نکل کر سمندر کے پانی پر محو پرواز ہو اور نظر اتفاقاً اپنے عکس پر پڑ جائے تو

اسے اپنا حریف سمجھ کر حملہ کرتی ہے اور اپنی جان کو سمندر کی لہروں کی نذر کر دیتی ہو۔ در اصل یہ شاہین ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ کوئی جداگانہ چیز نہیں۔

چرغ - جرہ - بحری - شاہین اور چرغ میں بہ لحاظ قد و قامت تھوڑا تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ پرند چونکہ سستا ہوتا ہے اور اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپیہ ہوتی ہے، نیز دلاور بھی ہوتا ہے اس لئے بکثرت پالا جاتا ہے ایرانی بحری اور شاہین کو زیادہ پسند کرتے ہیں، مگر پنجاب میں یہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔

ایرانیوں کی طباعی اور ذہانت تو مشہور ہے۔ اس فن میں بھی اُن کی اولیات اور اختراعات معجزہ سے کم نہ تھیں وہ چرغوں سے ہرن پکڑوایا کرتے تھے۔ سیاہ چشموں کے شکار میں جو لطف ہوتا ہے وہ گلال چشموں کے شکار میں نہیں ہوتا۔ گلال چشم جاتے ہی صید کو دبوچ لیتے ہیں۔ مگر یہ جھپٹے مار مار کر صید کے پرزے اڑاتے جاتے اور ساتھ ساتھ اُڑے چلے جاتے ہیں۔ میں نے خرگوش کے شکار میں دیکھا ہے کہ اوپر فضا میں یہ منڈلا رہے ہیں۔ بازدار نیچے سے خرگوش کو نکالتے ہیں۔ خرگوش وحشت زدہ خرگوش پورے زور سے دوڑتا ہے یہ اس کو دیکھتے ہی پل پڑتے ہیں۔ ایک جھپٹا مارتا ہوا اور غریب جانور کی کھال ادھیڑتا دوسری سمت نکل جاتا ہے۔ اتنے میں دوسرا حملہ کر کے خرگوش کا تیاپانچا کرتا مقابل کی سمت کو نکل جاتا ہو یہ اس پھرتی اور عجلت سے باری باری حملہ کرتے ہیں۔ کہ بھاگنا تو در کنار، خرگوش کا اپنے مرضی سے دو قدم چلنا بھی دشوار۔ بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ جنگل کے اندر حملوں کے صدمات سے یا تو خرگوش کا ادھ مرا جسم بلا ارادہ لڑھکتا اور جگہ بدلتا نظر آتا ہے۔ یا غریب حیوان کی جگر خراش چیخیں نچی ہوئی کھال کے پرزے اور خون کے چھینٹے ہر چہار طرف اُڑتے دکھائی پڑتے ہیں۔ شکاری ارد گرد کھڑے اپنی ہنر مندی پر دل ہی دل میں پھولے نہیں سماتے۔

ماہرین نے عام طور پر اس کی تین قسمیں کی ہیں۔ اور رنگ کے لحاظ سے سفید۔ سرخ۔ زرد اور خاکستری۔ اسکے سوا چرغ کا اور کوئی رنگ نہیں۔ رنگ کے اعتبار سے عمدہ چرغ وہ ہوتا ہے جس کا سر سفید اور پیٹھ پر سفید سفید نقطے ہوں۔ دُم نسبتاً زیادہ سپید دکھائی دے اسے نگاریں کہتے ہیں۔

سفید سر والا ایک اور چرغ ہوتا ہے جس کی دُم اور سر دوسرے چرغوں کی نسبت زیادہ چٹے ہوتے ہیں، اس کو مروارید دم اور "سپید نگاری" بھی کہا جاتا ہے۔

بازنامہ ایران کا مصنف علی بن منصور[1] لکھتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے خواجہ علی نیشاپوری نے قیلقمور یاسوس چغتائی کے پاس بھیجا تھا۔ میں نے وہاں ایک چرغ دیکھا تھا جو "طیغو باز" سے بھی زیادہ چٹا تھا اس کے پر غزہ دم کے سب چھوٹے بڑے پر نہایت سیاہ تھے۔ یہ چرغ مملکتِ تیموریہ سے بھی زیادہ قیمتی ہوگا۔ در اصل یہی نگاریں تھا۔

عمدہ چرغ وہ ہے جو جسیم ہو۔ جثہ گوشت سے بھرا ہوا ہو زشت رو۔ انگلیاں طویل۔ پنجے قوی اور مضبوط۔

---

[1] بازنامۂ ایران یا شکارنامۂ ایلخانی ایک ہی ہیں۔

تلوے چوڑے. ناخن سیاہ - پنڈلیاں چھوٹی اور موٹی - دُم مرواریدی - سینہ فراخ - سر بڑا - منقار نہایت سخت اور مضبوط کتے کی طرح بیٹھے - جلد جلد کھائے اور بھوک میں بے تاب ہو جائے -

شُنقار - یہ قد و قامت اور جُثہ کے لحاظ سے عقاب سے بھی بڑا ہوتا ہے اس کے چار رنگ مشہور ہیں، سفید جس میں کسی دوسرے رنگ کی مطلق آمیزش نہ ہو - ناخن اور منقار بھی دودھ کی طرح سفید ہوں - اسے طیغو کہتے ہیں - دوسرا ایسا سفید جس کے ہر چھوٹے بڑے پر کے اوپر سیاہ نقاط ہوں - اس کی چونچ اور پنجے بھی سفید ہوتے ہیں اسکو نگاریں کہا جاتا ہے اور بڑی نادر چیز شمار ہوتی ہے -

ایک اور قسم ہوتی ہے جو "چوزگی" میں شاہین اور چرغ کے مانند - مگر زردی کے لحاظ سے ان سے زیادہ زرد کریز کے بعد شاہین کی طرح کبود رنگ ہو جاتا ہے - یہ قسم تمام قسم کے شنقاروں سے زیادہ سخت کوش ہوتی ہے - کالا شنقار بھی ہوتا ہے - شنقار جتنا بزرگ جثہ ہوگا اتنی ہی اچھا کام دے گا - کہتے ہیں یہ جب بھوکا ہو تو اپنا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگ جاتا ہے

سنگ سنگ - شنقار کی قسم کا جانور ہے - روم کی طرف سے لاتے اور شنقار قرابہ بولتے ہیں -

خناقہ - چرغ کی قسم کا جانور ہے - مگر جسم میں چرغ سے قدرے چھوٹا - اسے اٹک میں "چرگیلا" کہتے ہیں، اعمال کے لحاظ سے شاہین اور چرغ کے بین بین ہوتا ہے - جن چیزوں کا وہ شکار کرتے ہیں ان میں بعض کو یہ بھی پکڑ لیتا ہے بعض نہیں پکڑ سکتا - اس کے ذاتی اوصاف کا چرغ پر قیاس کر لیجئے -

لگڑ - بہت عام پرندہ ہے - ہمارے دیہات پر اس کی خاص نظرِ عنایت ہے، مرغ اور بٹیر کا خاص دشمن ہے - بلندی سے توپ کے گولے کی طرح پرندوں پر گرتا ہے -

طغرل - ایک پرندہ ہے باز اور شنقار کے بین بین - سر اور پاؤں باز کی طرح جسم اور پر شنقار کے ایسے - یہ دو رنگ کا ہوتا ہے اول کالا - جس کے پاؤں بغایت زرد ہوتے ہیں - گویا کسی نے سونے کا جھول چڑھا دیا ہے - دوسرے کی منقار اور آنکھیں مرغ کی طرح سُرخ - بعض کے پاؤں اور چونچ کا رنگ ہاتھی دانت کا ایسا ہوتا ہے - ناخن درشت اور سیاہ ہوتے ہیں -

یہ پرندہ خطا کی طرف سے آتا ہے - ابوالنجرمی لکھتا ہے کہ خوارزم شاہ نے خیوا سے سنہ ۹۱ھ میں امیر اسمٰعیل بن احمد کے لئے شکاری پرند بھیجے تھے ان میں ایک اعلیٰ طغرل بھی تھا - کالا رنگ - منقار بغایت زرد - آنکھیں لال انگارہ سی -

علی بن منصور نے ایک طغرل دیکھا تھا جسے دریائے ماژندران کے کنارے گرفتار کیا گیا تھا - کوئی پہچان نہ سکا - مگر باز نامہ سے معلوم ہوا کہ یہ طغرل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ طغرل نایاب اور نادر الوجود پرندہ ہے -

شکاری پرندوں کے سدھانے اور شکار کے لئے طیار کرنے کے طریقے بہت دلچسپ ہیں۔ ایرانی بازداروں کے طریقوں اور ہندوستانی میرشکاروں کی طرز وروش میں فرق ہے۔

بازوں کی آمد اور گرفتاری کا زمانہ

باز ماہ آذر کے نصفِ آخر میں پیشیان اور ترکستان سے جہاں ہمیشہ برف پڑتی رہتی ہے آتے ہیں۔ پھر جب سردیاں شروع ہوتی ہیں تو یہ جاڑے کے خوف سے اگست میں وہاں سے بھاگ کر گرم ممالک کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مرغابیاں پہلے نقل مکانی کرتی ہیں اور باز ان کے بعد۔ جب حدود خراسان میں پہونچتے ہیں تو وہاں رہ پڑتے ہیں کیونکہ کوہ فرادہ۔ عمران۔ مازندران۔ کنہ وداور سمرد کی وادیوں میں اور اناران وزار مرو کے نواحی علاقہ میں چکور اور خرگوش وغیرہ بافراط ملتے ہیں۔ ابتدا رتھر میں صیاد وہاں انھیں پکڑ لیتے ہیں۔

ہندوستان میں جہاں پانی کے بڑے بڑے تالاب ہوں۔ مرغابیوں کی بہتات ہو۔ درختوں کے جھنڈ ان قطعاتِ آب کے گرداگرد دور تک پھیلے ہوئے ہوں۔ ایسے گھنے جنگلوں میں باز رہ پڑتے ہیں اور ہندوستانی چڑیمار وہاں سے بازوں کو پھانس لاتے ہیں۔

جب باز جال کے اندر پھنس جاتا ہے تو صیاد ایک چادر کی اوٹ میں جاکر فوراً باز کی آنکھیں سی دیتا اور پاؤں میں "بند" ڈال دیتا ہے۔ اوٹ میں جانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جانور انسان کو دیکھنے نہ پائے۔ چونکہ یہ بہت ہی زیرک اور دانا پرندہ ہے اگر ابتدائے اسیری میں اس کی نظر انسان پر پڑگئی تو وہ اس دشمن کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

باز کے سدھانے کا ایرانی طریق

جب چشم دوختہ باز کسی بازدار کے ہاتھ آتا ہے تو رات کے پہلے حصہ میں چراغ کے سامنے لے جاکر آنکھوں کے ڈورے کسی قدر ڈھیلے کرکے نہایت ملاطفت ونرمی سے اس کے سینہ پر ہاتھ پھیرتے اور مہربانی کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ تین دن سے زیادہ آنکھیں بند کرنا جایز نہیں جب آنکھیں کھولنی ہوتی ہیں تو رات کے پہلے پہر میں قدرے کھول دیتے ہیں۔ اڑھائی پہر رات گزر جانے تک بیدار رکھتے ہیں۔ اس کے بعد آرام کے لئے پتوار پر باندھ دیتے ہیں۔ چوتھے دن رات کو ساری آنکھ کھول دیجاتی ہے اس اثنا میں باز کا چہرہ کنکھیوں سے ہی دیکھتے ہیں، سامنے سے نہیں دیکھتے، اس سے باز کے دل میں بازدار کی طرف سے خوف دہراس پیدا ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل جب آنکھ بہت تھوڑی کھولتے ہیں تو بہت چمکار پچکار کر باآہستگی ہاتھ پر بٹھلاتے اور کسی نہ کسی طرح گوشت کا ایک پارچہ اس کے پنجوں میں پکڑا دیتے ہیں تاکہ وہ سیر ہوجائے۔ پہلے دن تین گھنٹے تک باز کو جگاتے اور ہاتھ پر بٹھاتے ہیں، دوسری رات آدھی تک۔ اور تیسری رات تمام شب۔ اس کے بعد "پتورا" پر باندھ دیتے ہیں، کہ پروں کو پھٹپھٹا کر درست کرے، اور قدرے آرام پاسکے۔

پو پھٹتے پھر باز کے پاس جاتے ہیں، مگر اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کھڑے کھڑے باز کے سامنے نہیں

جاتے۔ خواہ تاریکی ہی کیوں نہ ہو۔ بیٹھے بیٹھے اور اپنے آپ سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں اور باز کی طرف پشت کرکے بیٹھ جاتے ہیں، پھر نہایت احتیاط سے پتوار سے ہاتھ پر اُٹھا لیتے ہیں، لیکن اس بات کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ باز پھڑکنے پائے نہ کوئی آدمی باز کے پیچھے اور پہلو سے گزرے۔ دس بجے دن تک ہاتھ پر بٹھائے رکھتے ہیں۔ اس میں بھی خاص اُستادی برتی جاتی ہے، بوقتِ چاشت "گوشت پشتِ تازہ" کا طعمہ کسی نہ کسی طرح خوب پیٹ بھر کر کھلا دیتے ہیں پھر "پدواز" پر بٹھا دیتے ہیں، "پدواز" تاریک کمرہ کے اندر بنایا کرتے ہیں، عصر کے بعد جب شام ہونے لگتی ہے۔ باز کو "پدواز" سے کھول کر ہاتھ پر اُٹھا کر گزرگاہ عام پر جا بیٹھتے ہیں۔

جب تک پرند پتوار یا پدواز پر رہتا ہے، پانی کا برتن اس کے سامنے دھرا رہتا ہے، جب بھی ہاتھ پر اُٹھاتے ہیں، اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ باز پتوار سے ہاتھ پر آئے۔ اگر اس نے پدواز کی لکڑی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو تو جب تک وہ خود بخود اپنے پنجے ڈھیلے نہ کردے۔ زبردستی نہیں کرتے۔

جب باز گوشت برغبت کھانا شروع کردے، تو آہستہ آہستہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر بلاتے ہیں، ابتداء میں دور سے باز کو گوشت دکھا کر بلانا غلطی ہے۔ پہلے ایک سے دوسرے ہاتھ پر بلاتے ہیں پھر زمین سے ہاتھ پر، باز اور باز دار کے درمیان دس گز سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ جب اسکی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر دور سے بلاتے ہیں بلانے کی آواز کافی بلند ہوتی ہے۔ اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ باز، پدواز سے خود بخود ہاتھ پر آئے۔ یہ عادت پیدا کرنے کے لئے شروع شروع میں گوشت کا ٹکڑا ہاتھ میں لے جا کر باز کے پاس جاتے ہیں وہ گوشت کے لالچ میں ہاتھ پر آ بیٹھتا ہے بالآخر خالی ہاتھ سامنے کرتے ہی اُڑ کر اس پر آ جاتا ہے۔

ابتدائً دور سے بلانے کا یہ طریقہ ہے کہ باز کی ڈور کے سرے پر لوہے کا ایک حلقہ لگا دیتے ہیں، اس حلقہ سے سو گز کے قریب لمبی رسی گزار لی جاتی ہے، ایک شخص رسی کا سرا پکڑ کر دور جا کھڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں زندہ پرندے کر اس کو پھڑپھڑاتا اور باز کو بلاتا ہے۔ جب باز قریب پہونچتا ہے۔ رسی کو کسی قدر ڈھیلا کر دیا جاتا ہے تاکہ باز پرند پر ٹھیک طور سے آگرے۔ ورنہ اگر غلطی سرزد ہوگئی تو پھر وہ اس کے دل میں گھر کرلے گی۔ بلانے والے آدمی کا منھ باز کی سمت نہیں ہوتا بلکہ وہ آڑا کھڑا ہوتا ہے۔

جب باز بلانے سے فوراً آنے لگتا ہے اور پرندوں کے پکڑنے کی اسے عادت ہو جاتی ہے تو پھر یہ کرتے ہیں کہ جب وہ بلاتے وقت ہاتھ کے قریب پہونچتا ہے تو پرند کو زمین پر ڈال دیتے ہیں۔ جسے پکڑ کر وہ کھانے لگ جاتا ہے۔ باز دار باز کے گرد گھومتا اور بلند آواز سے بولتا رہتا ہے تاکہ وہ ان باتوں کا عادی ہو جائے۔ پھر وہ پرند کو چھین کر باز کو دور سے بلاتے اور خوب شکم سیر کر دیتے ہیں — اس عمل کے دوران میں اسے بازاروں اور شور وغل والے مقامات پر لیجا کر گھومتے پھرتے ہیں۔ جب باز ڈور سے چھوٹ کر آزادانہ طور سے آنا شروع کر دیتا ہے تو اس کے بعد درختوں وغیرہ

پر پھینک کر باز کو بلاتے ہیں اور چیخنے والے پرندہ اس کے پنجوں میں دے کر کھلاتے ہیں۔ اب "باولی" کا نمبر آتا ہے۔

پہلے دن ایک کبوتر لے کر اس کے بازوؤں کے چند پر اکھیڑ ڈالتے ہیں اور یہ "کم پر" کبوتر چھوڑتے اور پیچھے سے باز کو اڑاتے ہیں۔ جب وہ اس پرندہ کو پکڑ لے تو اُسے آزادانہ طور سے کھانے دیا جاتا ہے۔ اس دن باز کو ہاتھ سے کبوتر پر پھینکتے ہیں۔

دوسرے دن باز کسی درخت یا مکان کی چھت پر بٹھا کر۔ اُسی قسم کا کبوتر اُڑاتے اور باز سے پکڑواتے ہیں۔ اگلے دن کسی کھلے میدان میں لے جا کر "باولی" دیتے ہیں۔

جب باز، مرغ اور کبوتر کی باولی سے خوب مانوس ہو جاتا ہے تو تیتر۔ چکور۔ مرغابی وغیرہ کی باولی حسب ضرورت دے کر اپنا کام شروع کرتے ہیں۔

شروع شروع میں ایرانی یوں کرتے ہیں کہ جس پرندہ پر باز کو اُڑانا ہو ابتداءً شکار میں بار بار اُڑا کر خوب تھکا لیتے ہیں اور اس کے بعد باز اس پر پھینکتے ہیں۔ پہلے دن ایک دوسرے دن دو تیسرے دن تین علی ہذا دسویں دن دس پرندوں پر اُڑاتے ہیں۔ اب باز ہر طرح شکار کے لئے طیار سمجھا جاتا ہے۔

بے شمار ایسی ادویہ ہیں، جو گرسنگی اور حرص شکار پیدا کرنے کے لئے "ایام شکار" میں باز کو کھلائی جاتی ہے۔ ایرانیوں کا خیال ہے کہ نیا باز زیادہ سے زیادہ دو سال یا ایک سال کی مدت میں تیار کرنا چاہئے اور جُرّہ و شاہین چالیس دنوں میں۔ بیس دن سے کم مدت کسی طرح جائز نہیں۔

غالباً یہ مضمون ناتمام رہے گا اگر اس فن کی چند اصطلاحوں کا ذکر نہ کیا جائے۔

تعلیقاتِ بازداری

اڈا - اسے چکس کہتے ہیں۔ شکاری پرندہ اس پر بٹھائے جاتے ہیں۔

بازدار - اسے ترکی میں قوشچی کہتے ہیں یہ وہ شخص ہے جو باز کو شکار کے لئے تیار کرتا ہے۔ میر شکار اس سے الگ اور بلند حیثیت کا شخص ہے۔ اسے بازداروں کا سردار سمجھ لیجئے۔ کبھی کبھی دونوں حیثیتوں کا مالک ایک ہی شخص ہوتا ہے۔

بند - یہ پرندوں کی ٹانگوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کے اندر بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے ٹانگیں حرکت کرتی رہتی ہیں۔ بند وزن میں کافی ہلکے ہوتے ہیں اور لمبے بھی پانچ چھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ تاکہ پرواز میں حائل نہ ہوں۔ یہ ہمیشہ پرندوں کی ٹانگ میں بندھے رہتے ہیں۔

ان دونوں "بندوں" کا ایک ایک سرا تو ٹانگوں کے گرد لپٹا ہوا باندھ دیتے ہیں دوسرے سرے پر لوہے کے گلٹ شدہ خوبصورت حلقے ہوتے ہیں۔ ان دونوں حلقوں سے "شکار بند" (بالشت بھر لمبی رسی) گزارتے ہیں جو دوسری طرف لوہے کے اس شکل ∞ کے چھلے سے بندھا ہوتا ہے۔ جس کے نچلے حصے سے ڈور گزاری جاتی ہے۔ بند اول اول چمڑے کے ہوتے ہیں۔ جب پرندہ کی وحشت دور ہو جائے تو پھر ریشم اور طلا سے تیار کئے جاتے ہیں۔

باولی - وہ پرندہ یا جانور جو شکاری پرندوں کو سدھانے اور حریصِ شکار بنانے کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔

پتوار یا پدواز - دو لکڑیاں عموداً گاڑ کر تیسری لکڑی افقی صورت میں ان کے اوپر رکھتے ہیں (اس طرح ⊓) پرندوں کے آرام کے لئے کام آتی ہے - ہندوستان میں کافی بلند بناتے ہیں - مگر عرب میں زیادہ اونچی نہیں بناتے - "اڈا" مکانوں کے گوشوں میں ایک لکڑی سے بناتے ہیں اور پدواز یا پتوار ہر جگہ کام آتی ہے

پرتہرہ - پر سے مراد چند مخصوص ادویہ کا پروں میں لپیٹ کر شام کے وقت جانور کو کھلانا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ وہ صبح کس وقت ان پروں کو اُگل دیتا ہے - تہرہ - مرغ کی گردن کی ہڈیاں کھلانا -
چونکہ پر و تہرہ کا ایک ہی وقت دینا جانوروں کی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے اس لئے دونوں کو ملا کر پرتہرہ کہتے ہیں، پنجاب میں پر اُگلنے کے لئے "سر جھنڈنا" مستعمل ہے - میری نظر سے کوئی لفظ اُردو۔فارسی کا نہیں گزرا جو اس مطلب کو واضح کرتا ہو۔

تکمہ - طعمہ کی ایک قسم -

تلی - تلوے خراب ہونا - جس سے پنجوں کی قوتِ گیرائی بالکل زائل ہو جاتی ہے اور جانور ناکارہ ہو جاتا ہے -

ٹوپی - فارسی کلاہ - کلال چشموں کو صرف ابتدا میں جب سدھائے جا رہے ہوں پہناتے ہیں - بعد میں نہیں - مگر سیاہ چشموں کے سر پر ہمیشہ چڑھی رہتی ہے -

چنولی - وہ خوبصورت ڈورا جو گردن میں ڈالتے ہیں - اس کی لمبائی پرندہ کی گردن سے لے کر پنجوں تک ہوتی ہے اسے چلغو اور جلغو بھی کہتے ہیں -

دستانہ - اہل ایران اسے دستِ خاص اور "ہبلہ" کہتے ہیں، ہاتھ کو پرندوں کے ناخنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں -

دلبہ - ترکی میں قرالقو و قرالتغو کہتے ہیں - کوّے یا کبوتر کا ایک بازو پروں سمیت ایک لمبی رسّی سے بندھا ہوتا ہے - رسی گھما گھما کر سیاہ چشموں کو اس پر بلاتے اور سدھاتے ہیں -

ڈور - ایک خوبصورت سوتی یا ریشمی رسّی جس کی لمبائی تین گز کے قریب ہوتی ہے - اس سے بازو وغیرہ پتوار پر باندھے جاتے ہیں -

جوز - وہ پرند جس نے ابھی تک بچپن کے پر نہ گرائے ہوں -

شکرہ - مشہور پرندہ کے علاوہ ایرانی تمام شکاری پرندوں کے لئے شکرہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں -

طعمہ - وہ گوشت جو بطور خوراک پرندوں کو کھلایا جاتا ہے -

طعمہ آبدار - پانی میں ڈال کر طعمہ کھلانا تاکہ پانی بھی ساتھ ہی پی لیں -

طعمہ داری - ایک خاص ترکیب سے طعمہ اور جلاب دینا۔
توش خانہ - وہ مکان جہاں پالتو شکاری پرندر کھے جائیں۔
کریز - بچپنے کے پروں کو گرا کر اُن کی جگہ نئے پر نکالنا۔
گدی - اسے فارسی میں "قباچہ" کہتے ہیں، نو گرفتار پرندوں کو جب بازاروں میں پھراتے ہیں تو اس خوف سے کہ مبادا وحشت کھا کر پھڑکیں اور پر توڑ ڈالیں۔ "گدر" کی دو تھیلیاں سر باز و پر چڑھا دیتے ہیں۔

جس طرح لکھتے ہیں یک قطعہ زمین۔ مبلغ دو روپیہ۔ تین زنجیر فیل، چار راس بیل۔ اسی طرح ان پرندوں سے پہلے ہبآلہ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔

کچھ اصطلاحات میرزا سودا کی نظم میں آگئی ہیں ان پر خط کھینچ دئے گئے ہیں۔

فضل حسین تبسم

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خریدیں فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اُردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات

(پروفیسر فراق گورکھپوری کے ایک انگریزی مقالہ کا ترجمہ)

اگر مستقبل کی آنے والی صورتوں پر نظر رکھی جائے تو خیالات کی بہت سی اُلجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ کہنے کے لئے کہ ساٹھ برس کی دُنیا آج سے بالکل مختلف ہوگی، پیشین گوئی کی کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت نہیں۔ اسوقت ہندوستان آزاد۔ فارغ البال اور بخوبی منظم ہو چکا ہوگا۔ حکومت کا انتظام نہایت عمدہ ہوگا اور ثانوی تعلیم عام ہو چکی ہوگی ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ اسوقت ہمارا سماج اور حکومت اشتراکیت پسند ہوگی۔ ان باتوں کے تصور کے لئے اور آنے والی روشن و خوشگوار صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ آپ ایک زبردست انقلابی ہی ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی ادب کا اسوقت کیا عالم ہوگا؟ - وہ امور جو چالیس کرور انسانوں کو پیش آ چکے ہوں گے اور وہ تمام واقعات جو ان کے سامنے رونما ہوں گے، زبان و ادب کو بھی وہی واقعات و اُمور پیش آئیں گے اور اُن پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ آیئے ہم ان کے تصور کی کوشش کریں۔ جب ملک کا ہر باشندہ آزاد۔ فارغ البال اور ترقی یافتہ ہو چکا ہوگا تو ہمارے ادبی مشغلے بے انتہا وسیع ہو جائیں گے اور ادبی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ شخصی اور عام کتب خانے۔ کتابیں اور اخبار و رسایل کئی ہزار گنا بڑھ جائیں گے اور یہ اندازہ محض خیال آرائی یا غلو پر مبنی نہیں کیونکہ چالیس کرور مشتاق پڑھنے والوں کا تصور کیجئے تو آپ کو خود اس امر کا یقین ہو جائے گا۔

یہ ادبی پیداوار اور مشغلے اُردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل۔ تیلگو۔ کناری۔ ملایالم۔ اور غالبًا ہندوستان کی دو ایک دوسری خاص زبانوں میں ہونگے اور زیادہ تر ہر زبان کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہونگے۔ زبان کے اس ارتقائی دور میں جبکہ رفتہ رفتہ معیار کا تعین ہو رہا ہوگا دو طرح کے اثرات پیدا ہو رہے ہوں گے۔ عوام کا دباؤ اور ان گنت انسانوں کا نیچے سے اور ہر چہار جانب سے اثر اس قدر حاوی ہو جائے گا کہ ہر ہندوستانی زبان کی فرہنگ میں ان کے الفاظ محاورات۔ فقروں اور بولی ٹھولی اور عام طرزِ گفتگو کا، جو اب تک ہمارے ادبی حدود سے خارج رہے ہیں، ایک سیلاب سا آ جائے گا اور اسی کے

مقابل دماغی، علمی، جمالیاتی اور حسن کاری جذبے اور شخصیتیں اس خارجی اور اندرونی سیلاب کے ساتھ آنے والے الفاظ و محاوروں کو ایسے سانچے میں ڈھالیں گی اور ایسی شکل و صورت عطا کر دیں گی جو ان کو ادبی قیمت و استقلال بخشنے گی ہر زبان کی ارتقا سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر زبان کی تاریخ اس کے الفاظ میں وسعت، قوت، جذب، ٹھہراؤ اور روانی پیدا کرنے اور ان کے باہمی گھلنے ملنے سے نئی شکلوں، نئے معنی، اور نئے مشتقات مرتب ہونے کی ایک داستان ہوا کرتی ہے۔ جس طرح معاشیات میں جمہوری نظام کی خصوصیت ہے کہ نئی صورتیں بنتی ہیں۔ پھر بگڑ جاتی ہیں اور ان کے اس بناؤ بگاڑ کے باہمی اثر سے پھر نئی شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی طرح زبان بھی ایک 'جدلی' اصول ارتقا کے ماتحت بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ عوام کی زبان۔ ڈھیلی بے جوڑ۔ بے رنگ اور بھدی ہوا کرتی ہے اور ایسی زبان ادب نہیں ہوا کرتی اور نہ یہ تحریر کی زبان ہوتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ادب خام اور زبان خام ہے۔ لیکن ایک تعین معیار کے دور سے گزرنے کے بعد زبان اپنے اعضا، رگوں اور نسوں میں ایک سختی سی محسوس کرنے لگتی ہے۔ الغرض گویا ہر زبان میں عوام سے "اثر پذیری" اور "تعین معیار" کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی خاص زبانوں میں نئی سادگیاں۔ نئی پیچیدگیاں۔ نئے تشبیہی اقسام اور نئے معنوی اختلافات۔ نئی آزادیاں اور نئی پابندیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دو ہزار برس سے زیادہ ہوا کہ یہ ہندوستانی زبانیں عوام کی عام بولی کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھل پھول رہی تھیں۔ ان میں نہ تو ستھرا پن آیا تھا اور نہ انھوں نے معیاری حیثیت حاصل کی تھی۔ ان میں سے ہر زبان کی بیسیوں مختلف قسمیں تھیں۔ ان زبانوں کا کوئی ادب نہ تھا۔ سارے ہندوستان میں ادب کی زبان صرف سنسکرت تھی۔ لیکن سنسکرت میں سختی پیدا ہو چکی تھی اور اب وہ ہندوستانی باشندوں کے کسی گروہ کی بھی بول چال کی زبان نہ رہی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت میں دفعتاً تنزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور مہاتما بودھ کے عروج کے ساتھ پالی اور پراکرت ادب پیدا ہونا شروع ہوا۔ اسی سلسلہ میں اس موقعہ پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ پالی اور پراکرت "بولیوں" کا وجود مہاتما بودھ کا رہین منت نہیں۔ یہ بولیاں سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کی حیثیت سے پہلے ہی رائج تھیں۔ بودھ جی کی وجہ سے صرف زبانوں کا ادب پیدا ہوا۔ (یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یورپ میں بھی اسی طرح یورپ کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جو لاطینی زبان سے نکلی ہوئی مقامی بولیاں رائج تھیں ان سے ایک رومانوی ادب پیدا ہونے لگا تھا) الغرض اسوقت کی خاص خاص ہندوستانی زبانوں کی پیدائش پراکرت، پالی اور سنسکرت سے نکلی ہوئی دوسری بولی جانے والی زبانوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا تھا کہ جب یہ زبانیں وسیع ہوں گی اور نہ صرف اپنی عام بول چال بلکہ دوسری زبانوں کی بولی ٹھولی کو اپنے اندر جذب کر لیں گی تو کیا ہر زبان کے حدود مستقل طریقے سے متعین کئے جا سکیں گے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا

چاہیئے کہ ساٹھ برس کے بعد عام ثانوی تعلیم استقلال اور مضبوطی سے رائج ہو چکی ہوگی۔ بیکن (Bacon) نے کہا تھا کہ تصنیف و تحریر آدمی میں درستی و صحت کا مادہ پیدا کر دیتی ہیں۔ تحریر سے زبان میں بھی درستی و صحت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں جسقدر بہت اور سائنٹفک ترقی بڑھے گی اتنا ہی زندگی اور زبان کا ایک معیار پیدا ہوتا جائے گا۔ لیکن زندہ اور مربوط نظم کے بغیر اس وسعت پذیری کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ گویا اس طرح ہر ہندوستانی زبان کا ایک معیار اور ایک مانوس انداز ہوگا۔ لیکن اس کی کوئی شکل اور زبان کا کوئی مقامی عنصر ادبی حدود سے خارج نہ ہوگا۔ پیشہ وروں کی بول چال، مقامی بول چال اور ادبی بول چال۔ یہ سب کم و بیش ادبی حدود میں داخل ہوں گے۔ ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ ترقی اور جرأت کے ساتھ اپنے اندر لچک اور وسعت پیدا کریں گی تاکہ ہر طرز گفتگو کو شامل کر کے ان کو مضبوط تر بنا دیں۔ کئی وجوہ سے آجکل کی تحریری زبان زیادہ ڈلائی اور واقعاتی سی بن رہی ہے۔

آجکل عالمانہ "حلقے" جو دقیق و پیچیدہ الفاظ کی طرف مایل ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اس تحریک سے کافی پریشان اور متاثر ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو عوام کی سمجھ، عادات اور ان کے تخیلی اور جذباتی گفتگو کے محاورات سے زیادہ قریب لانا چاہیئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ زبان و ادب کو "مخصوص پسند" نہیں ہونا چاہیئے اور اس خاص طبقہ کی ملکیت نہ بن جانا چاہیئے۔ لیکن ادب بے جان حد تک نہیں گرایا جا سکتا۔ الفاظ و اسلوب کی یک رنگی نہیں پیدا کی جا سکتی کیونکہ اس سے ادب بے جان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور سے وکٹوریہ کے وسطی عہد کو لے لیجئے۔ اس عہد کے اسالیب بیان میں حیرت انگیز حد تک تنوع تھا۔ ٹیٹر کے الہامی جملات، کارلایل کی آتش فشاں طرز نگارش، میکالے کے پر جوش جملے۔ رسکن کی زریں و پر شوکت نثر، نیومین کے پاک و لطیف محاسن، میتھو آرنلڈ کا مجتہدانہ اسلوب، تھیکرے کا ہیجان انگیز مکالماتی انداز۔ اسٹیونسن کا جذباتی طرز۔ والٹر پیٹر کی تجزیہ نگاری۔ یہ سب کچھ آپ کو ملے گا خود شیکسپیر کے یہاں اگر ایک طرف جاہلوں کو خوش کرنے والی زبان پائی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کے غلو کا یہ عالم ہوتا تھا گویا اس دنیا کی چیز ہی نہیں۔

میں نے اب تک اُن تبدیلیوں کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی زندہ و مربوط ترقی کے دور میں ہندوستان کی خاص زبانوں میں واقع ہوں گی اور جن کی ہمیں آنے والے عہد میں امید رکھنی چاہیئے۔ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں کجری۔ برہا۔ دیہاتی گیت۔ عوام کی کہانیاں، ٹک بندیاں، پیدایش موت کے گانے، مزدوروں کے گانے۔ سپیروں کے گانے۔ جادوگروں کے گانے اور منتر موجود ہیں لیکن ان کا صرف ایک غیر محسوس سا وجود ہے۔ انکو بہت جلد جمع کر کے نشر کرنا ہوگا۔ یہی حال عوام کی کہاوتوں ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ہوگا۔ اسکے بعد ان چیزوں کا ادبیات کے اندر دخل و جذب کا عمل شروع ہوگا اور اسی کے ساتھ ان زبانوں کے غیر متعین

حدود متعین ہونا شروع ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی حدود ختم ہو کر ایک عام سماجی مساوات کے قیام کا عمل بھی جاری ہوگا جس سے نئے سماجی پہلو نمودار ہوں گے۔ ہندوستانی عوام کے صبر و اطمینان میں پہلے ہی سے حرکت پیدا ہو چکی ہے اور اب یہ تحریک تیز و شدید تر ہوتی جا رہی ہے اس لئے عام ثانوی تعلیم کی وجہ سے ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ مضبوط و مستقل ہو جائیں گی۔

زبانوں کی اس وسعت کا ایک دلچسپ اور اہم نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ان میں اُن علمی اور اصطلاحی الفاظ کا سیلاب آ جائیگا جو مختلف آلوں یا مشینوں سے متعلق ہوں گے۔ یہ الفاظ اکثر موقعوں پر بالکل بدیسی ہوں گے اور بعض اوقات انھیں ہندوستانی شکل بھی دیدی جائے گی۔ البتہ کبھی کبھی خالص ہندوستانی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ عوام و خواص، دونوں ان الفاظ کی تشکیل و رواج میں حصہ لیں گے۔ آج ہماری تصنیفات کے بیانی واقعاتی اور تخیلی حصوں میں ریل - فن - ہوابازی - جہازرانی - فیکٹریوں - دواؤں - جراحی - انجینیری وغیرہ کے متعلق الفاظ بالکل مفقود ہیں۔ پروفیسر سینٹبری (Saintsbury) نے لکھا ہے کہ لایف آف نلسن[1] لکھتے وقت ساؤدی کو بحری زندگی سے متعلق ایسے فقروں سے سابقہ پڑا اور اتنی ہوشیاری کی ضرورت پڑی ہے گویا کوئی بلی چینی کے برتنوں سے گزرے۔ ساؤدی کی "لایف آف نلسن" اور کونارڈ کے ناولوں کے پڑھنے والے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان میں کتنی کثرت سے علمی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ ہارڈی نے نجومی حقیقتوں اور شکلوں کے جسقدر صاف تذکرے کر دئے ہیں اور مزدوروں یا کسانوں کی زندگی کے جیسے مانوس نقشے پیش کئے ہیں وہ قارئین کے لئے بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور صبر آزما بھی اس میں شک نہیں کہ فرنگی زبانوں کے اثر سے ہماری زبان اس رنگ کو قبول کر رہی ہے، لیکن ابھی تک صرف ذہنی اور تخیلی ادب میں اس کا اثر ہو رہا ہے اور عوام کی تنوع زندگی سے متعلق ہونے والے الفاظ کی بہت کمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے امریکہ کے باشندوں پر فخر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہر چند وہاں کی ابتدائی کتابیں بلی اور کتے سے شروع ہوتی ہیں اور ہماری کتابیں ہمیشہ خدا سے شروع ہوا کرتی ہیں، لیکن اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ کیا اسی وجہ سے فطرت اور حقیقت پر ہماری گرفت ڈھیلی نہیں پڑ گئی ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟ الغرض ہمارے ادب کو اب فطرت و حقیقت پر زیادہ مضبوط گرفت حاصل کرنی ہے۔ دماغ اور ہاتھ کی باہمی بیگانگی کا دور کافی طویل ہو چکا ہے ہتھوڑے اور ہنسیا کو بھی ہمارے ادب میں مناسب جگہ ملنا چاہئے اور حقایق زندگی کو ہندوستان کے ادبیات میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونا چاہئے۔ اس جگہ شیکسپیر مجھے پھر یاد آتا ہے جس کے ادبیات کے تنوع کو دیکھ کر کارلایل نے کہا ہے کہ اگر وہ

---

[1] (Nelson) مشہور انگریزی امیر البحر کا نام ہے جس نے نپولین کے مشہور فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دی اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ انگریزوں کا زبردست قومی ہیرو ہے اور ساؤدی نے اس کے سوانح حیات لکھے ہیں۔

کوئی بڑا شاعر نہ ہوتا تو ایک بڑا سپاہی ہوتا یا بڑا کسان یا بڑا دستکار۔ بہر حال زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی حیثیت ممتاز ہی تھی۔

اب یہاں بعض اُصولی مسایل سامنے آتے ہیں۔ تہذیب نے ادب کی طاقت اور امکانی قوتوں کا بہت دھندلا سا اندازہ کیا ہے۔ ابھی عام اور موثر طریقے کی ثانوی تعلیم کا نفاذ تو نہیں ہوا لیکن ہم اس عہد سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور وہ منزل دور نہیں کہ ہم اپنے اس خواب کی عملی تعبیر دیکھ سکیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ اہم سوال اور ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے زیادہ نازک مسئلہ "بچے اور ان کا ادب" ہے۔ سن رسیدہ آبادی بڑھکر ویسی ہی ہوگی جیسے ہمارے بچے ہوں گے۔ ہم کو بہت جلد بچوں کے لئے لاکھوں کتابوں کی ضرورت پڑنے والی ہے۔ علم ہجا اور شروع کی پرائمروں سے لیکر احمقانہ و عقلمندانہ نثر و نظم سبق آموز کہانیوں، تمثیلوں جن و پری کی کہانیوں، سیاحتوں۔ ہمت افزا داستانوں تاریخ، جغرافیہ، سوانح حیات، مضامین، ناول، ڈرامے، روزمرہ سائنس کی کتابوں۔ قاموس و لغات میگزین تصویروں کے البم اور نقشوں تک ہر چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے ہم کو بہت جلد اس کی فکر کرنی چاہئے کہ مصنفوں۔ مؤلفوں مترجموں اور اڈیٹروں کی ایک پوری فوج اس کام میں منہمک ہو جائے اور موجودہ صدی کے ختم ہوتے ہوئے اس مقصد میں کافی کامیابی حاصل ہو جائے۔ یہ اتنا مفید کام ہے کہ ہماری صوبجاتی حکومتوں لیڈروں اور ماہرین تعلیمات سب کو ملکر اس طرف توجہ ہونا چاہئے۔ شیر خواری سے چودہ برس کی عمر تک یہ نہایت اہم اور ضروری امر ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کی اپنی ضرورتوں کے مطابق بہترین ادب تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں بالغوں کے ادب کا بھی اچھا خاصہ حصہ بچوں کے مذاق کے مطابق کاٹ چھانٹ کر شامل کرنا ہو گا۔

ہر چند مطالعہ کی عادت سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے اس کا دارو مدار زیادہ تر شخصی رجحان پر ہے، لیکن اگر ہم چاہیں تو اس میں مسلسل ترقی پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کو بے لطف، خشک اور مشکل کتابوں تک محدود رکھنے سے یہ تو ممکن ہے کہ آپ سو فیصدی میٹرک۔ اور لاکھوں گریجویٹ پیدا کر لیں لیکن آپ مطالعہ کو ایک قومی عادت بنانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قوم دلچسپی لیکر پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ کلرکوں کی قوم ہو گی۔ مطالعہ کی عادت یا سوچنے اور رائے قایم کرنے کی عادت ابتدا، عمر ہی میں پڑ جانی چاہئے۔ بعد کے سالوں میں اس میں صرف پختگی پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس اہم نفسیاتی حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ بچے کتابوں اور مطالعے کو پسند کرتے ہیں اور ہم یہ کرتے ہیں کہ یا تو ان کی اس ذہنی اشتہا کو ختم کر دیتے ہیں یا پھر غیر مناسب اور تھکا دینے والی کتابیں دیکر ان کے دل سے مطالعہ کی تمام محبت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس افسوسناک صورتِ حال کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ ایسی نظموں، کہانیوں یا کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کیجئے جن کی یاد اب بھی آپ میں غیر معمولی جوش و حسرت پیدا کر دیتی ہو اور جنھوں نے آپ کے عہد طفلی کو روشن کر رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مشکل ہی سے ایک دو ایسی مثال یاد کر سکیں یا ممکن ہو کوئی نہ یاد آئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے گریجویٹ نوے فی صدی زجہانتک

مطالعہ کی قومی عادت کا تعلق ہے) ان پڑھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اخباروں پر وقتی طور سے، معمولی دلچسپی کے ساتھ نظر ڈال لینے کے علاوہ جس میں غور و فکر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہوتا وہ شاید اور کچھ نہیں پڑھتے۔ یہ تمغے کا دوسرا رخ ہے اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پر میکالے کی مشہور رپورٹ کی دوسری توضیح۔ شاید میکالے کی متجسس نگاہوں کے لئے یہ مسئلہ اسقدر واضح تھا کہ وہ اس کو نہ پاسکے۔ سال بہ سال ہم لوگوں کو یونیورسٹی میں سیکڑوں انڈر گریجوٹس سے سابقہ پڑنے کا صبر آزما اور تکلیف دہ تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ قابل افسوس امر یہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ اُلجھا ہوا ہوتا ہے قابل افسوس امر یہ ہے کہ ان کا دماغ بالعموم خالی رہتا ہے اور حقیقتوں سے ان کو کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ اپنے ذہنی خلا کے باعث وہ بالکل مردہ دیوار کے مانند ہوجاتے ہیں۔ ان کو ذہنی اخذ سے ایک فطری مخالفت سی ہو جاتی ہے اور کسی چیز پر بحث کرنے یا غور کرنے یا کسی سوال کے پوچھنے یا اس کا جواب دینے سے قطعاً گریز کرنے لگتے ہیں۔ ان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی یہ محض طلبا کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ بیچارے تو ایک ایسے بے رحم نظام کا شکار ہوتے ہیں جو بے ضرورت دباؤ۔ غلامی۔ مفلسی۔ اقتصادی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور تمدنی ترقی کو شروع ہی سے اُلجھاووں میں پھنسا کر بالکل خاتمہ کر دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی طفلی اور شروع جوانی کے درمیان میں لڑکے اور لڑکیوں کی اُنگلیاں اور نگاہیں ایسے لاکھوں صفحوں سے گزرتی ہی ہیں جو نوخیز عمر والوں کے استعمال کے لئے موزوں ہوسکتے ہیں اور جوان کی مناسب ذہنی غذا کا کام دے سکتے ہیں۔ بچوں کے کثیر اور تندرست ادب کے بغیر قوم کی ذہنی بھوک شروع ہی میں مرجاتی ہے۔ بچوں کی مناسب کتابوں کا کال ان کے جوشیلے ذوق کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ان کے دل ریگستان میں پیدا ہوتے والے پھولوں کی طرح خاموشی سے کمہلا جاتے ہیں۔ اپنی قومی زندگی کے گہوارہ اور بنیاد سے بیگانہ رہنے میں ہمارے لئے زبردست خطرے ہیں اور پھر اب تو اس بے نیازی کی بھی انتہا ہوگئی!

اس لئے اگر آیندہ صدی تک ہمیں کچھ کرنا دھرنا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ابھی سے نوخیزوں کے لئے مناسب متنوع اور متدارج ادب کی کافی پیداوار پیدا کریں اور رسام استعمال کے لئے نہایت وسیع اور ہمہ گیر طریقہ عمل ہوشیاری سے مرتب کریں۔ مناسب ہوگا کہ ایک دو الفاظ میں اس کا بھی تذکرہ کرتا چلوں کہ یہ کتابیں کس طریقہ کی اور کن خصوصیات کی حامل ہوں گی۔ میری رائے سوامی رام تیرتھ کے اعتراض کے باوجود یہی ہے کہ بچوں کی کتابوں میں خدا نہیں بلکہ کتے اور بلی کا عنصر زیادہ ہونا چاہئے۔ بچوں کا وجود بالکل فطری وجود ہوتا ہے۔ ان کو نہ مذہب سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ اخلاقیات سے۔ اب وہ دور ختم ہوچکا ہے جبکہ بچوں کی کتابوں کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی کلیات پر رکھی جاتی تھی۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امر میں ان کی مدد کریں کہ پرانے وراثتی تعصبات اور نفسیاتی کمزوریوں سے آزاد ہو کر سوچیں اور سمجھیں۔ مذہبی اور اخلاقی تربیت کی جگہ اب ذہنی اور فراستی تعلیم کو لے لینی چاہئے تاکہ دل دماغ اور ہاتھوں کے تعاون سے ایک نیا اور معقول تمدن پیدا کیا جاسکے۔ احترام کا جذبہ خدا کے ماننے پر مبنی نہیں ہے

نہ کسی مخصوص مذہب یا عقیدے کا ٹھیکہ ہے۔ لہذا بچوں کے ادب میں مذہب اور اخلاقیات کا نہیں بلکہ ٹھوس مادی چیزوں کا پلہ بھاری ہونا چاہیے۔ بچوں کا ادب بناتے وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ پڑھنے والوں میں فطری اور سماجی اُصولوں سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بچے بے حقیقت ہوائی باتوں سے تھک جاتے ہیں اور تمام اخلاقی بکواس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ فرنیکلن کی (My Autobiography) سے لیکر سمویل اسمائیلس کی (Self help) تک۔ اس قسم کا تمام ادب ایک ناقابل فہم دور سے آنے والی چیخ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے قصے میں سرمایہ کی طرف سے ہم کو خوفزدہ بنا دیتے ہیں۔ بچوں اور نوخیزوں کے لئے جو ادب ہے اس میں ہمیشہ ایک مخصوص سماجی مقصد کی جھلک ہونی چاہئے اور ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں موجودہ سماجی نظام کی مخالفت کرنا پڑے گی اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بچوں کا ادب نہ صرف تعمیری بلکہ تخریبی بھی ہوتا ہے۔ سورماؤں کی کہانیاں۔ کنگسلے کے افسانے یا پلوٹارچ کی تاریخی کہانیاں فائدہ مند بھی ہیں اور مضر بھی۔ کیونکہ نوخیزوں میں وہ ذاتیات کے جذبات اُبھارتی ہیں میں مانتا ہوں گو ایسی کہانیاں اور خصوصیت سے پلوٹارچ عصر جدید کے لئے فایدہ سے خالی نہ ہوگا لیکن نوخیزوں کی زندگی کے تشکیلی اثرات میں ان کی تقابلی اہمیت بہت بدل جائے گی۔ وہ سورما نہیں جو اپنے علاوہ اور کسی کے لئے سورما نہ تھے بلکہ سورما وہ تھے جو بڑی بڑی تعمیری مہمات کے سرگروہ تھے اس لئے ان کے سوانح حیات ایسے صاف اور مانوس انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ نوعمروں کے نوخیز ترقی پسند احساسات کو نیلا معلوم ہو۔ لیکن اُن کو ایک رُخی تعریف پر ختم نہ ہونا چاہئے۔ ان کی زندگی کی محدود حیثیتیں، ان کے مانے ہوئے مہلک اصول اور مسلمات بھی صاف صاف بتا دینا چاہئے۔ ہمارے سورما اچھے ہوں یا بُرے لیکن بچوں میں سورما پرستی کے جراثیم نہ پیدا کرنے چاہئیں۔ تاہم طرز نگارش کچھ ایسا ہونا چاہئے جو نوخیز قارئین کے دلوں میں احترام کے جذبہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دے۔

ان اہم امور کو مد نظر رکھتے ہوئے سوانح عمریوں کی ایک قومی بلکہ بین الاقوامی قاموس کا کام فوراً شروع ہو جانا چاہئے، بچے صرف بچے ہی نہیں ہوتے اور نہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔ کھیل کا فطری مادہ اور ذہنی رجحان جو اپنی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا ہے، یہ دونوں تہ میں درحقیقت ایک ہی چیز ہیں، بربری اقوام میں بھی فلسفہ داں۔ سائنس داں۔ موجد۔ حسن کار۔ سیاح۔ تجار۔ ناظم اور رہنما ہوتے ہیں۔ خارجی اور داخلی اسباب نفسیاتی وجوہ اور تمدنی و تاریخی ماحول کی وجہ سے ہمارے ہندوستانی بچے مغربی بچوں سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ بچوں کا ادب بنانے والوں کو ارزاں حب الوطنی اور ناقابل برداشت طفلانہ پن سے احتیاط لازم ہے۔ بچوں کی کتابوں کو وسیع حدود اور متنوع اقسام کا ہونا چاہئے جس میں ایسی لطیف اشارہ انگیزی پائی جاتی ہو کہ بیک وقت روشن دماغی، اضافۂ معلومات اور تجسّسِ ذہنی پیدا کرے

کیوں نہ ہم دورِ جدید کی ایک نئی (Hitopadesha) ایک نئی (Aesop کے) اور ایک نئی جنگل کی کتاب پیدا کریں جو عصرِ جدید کے ترقی یافتہ اور اضافہ شدہ علم پر مبنی ہو۔ ڈارون، ویلس، میٹرلنک اور کروپوٹکن ایسے مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات اور سائنس کے عجائبات کے تذکرے جب کروروں لڑکوں کے سامنے پیش ہوں گے تو ملک کے اس نوخیز طبقے میں ایک ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی لہر دوڑ جائیگی جنسیات کے مشکل مسایل کو بھی کافی ہوشیاری اور توجہ کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ ایک ایسا سماجی احساس پیدا کرنے کے لئے جو پوری دُنیا پر محیط ہو، ایک تشدد آمیز قومیت یا فرقہ پرستی کے جذبات کو روکنے کے لئے رجعت پسندانہ ذہنیت کو کچلنے کے لئے (Martyrdom of man) (انسان کی شہادت) ایسی کتابوں کو کافی ہر دلعزیز بنانے کی ضرورت ہوگی، تاکہ نہ صرف ان کے دماغوں بلکہ ارادوں کی بھی مناسب تربیت و ترقی ہوسکے شہنشاہیت سرمایہ داری اور مذہب اس عمل کو مدتوں سے روکتے رہے ہیں اس لئے بغیر کسی رعایت کے ان کا بھرم کھولنا چاہئے۔ مافوق الانسانی طاقتوں کی عقیدتمندی کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے لئے شاعری اور روحانیت کا خاتمہ لازمی نہیں۔ سائنٹفک خیالات کا انداز بھی کوئی بھدا اور غیر لطیف انداز نہیں ہے۔

آغاز کائنات کا مسئلہ۔ جغرافیہ۔ باغبانی۔ علم الحیوانات۔ علم النباتات۔ علم النسل اور معاشیات یہ سب ضمیر کی پوری پابندی کے ساتھ بچوں کو حاصل کرانے چاہئیں۔ بچوں کی کتاب کو کُند۔ بے لطف اور پھیکا بنا دینا سب سے بڑی خرابی ہے اور یہ پھیکا پن عموماً سطحی اور محدود علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماجی احساس۔ سماجی ارادہ و مقصد اور سماجی خیالات کو بچوں کی ذہنی زندگی کا ضروری جزو بنا دینا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ محسوس کرکے شدید تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے مشاہیر میں بھی سماجی احساس کا فقدان ہے۔ آج متوسط طبقے کی رسمی نیکیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہم کو صرف مفید چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایسی کتابیں چاہئے جن میں تصویریں ہوں، گانے ہوں، نظمیں ہوں، کہانیاں ہوں، مکالمے ہوں، ظرافت ہو، سائنٹفک معلومات ہوں، ایجادات کی کہانیاں ہوں، لطیفے ہوں، نقشے ہوں، معمے اور پہیلیاں ہوں اور مذہبیات و اخلاقیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ سماج کو بھی زندہ صفت اور زندگی بخش ادب کی پیداوار مہیا کرنے کا فن سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم کو فوراً اس اسکیم پر کاربند ہونا چاہئے اور قابل آدمیوں کی ایک جماعت تلاش کرکے ایک مرکزی ادارہ تعمیر نصاب کا قایم کرنا چاہئے۔

احمد حسین

"مکتوبات" میں ایک غلطی کی تصحیح

مارچ کے مکتوبات میں صفحہ ۱۶۰ پر جو شعر غالب سے منسوب کیا گیا ہے وہ ذوق کا ہے۔ محمد عبداللہ صاحب ایم۔ اے (گورنمنٹ کالج لائلپور) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس غلطی کی طرف مجھے متوجہ کیا۔

نیاز

مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں

نگار کا مصحفی نمبر دیکھا، میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔ تقریباً سب مضامین اچھے ہیں لیکن نمبر میں حیات مصحفی خوب ہے اور یہ سچ ہے کہ اگر آپ صرف یہی مضمون شایع کر دیتے تو کافی تھا، لیکن اس نمبر میں بعض اہم لغزشیں بھی ہیں جن کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ ’’نگار‘‘ جیسے موقر رسالہ میں اس قسم کی غلطیاں رہ جائیں۔

صفحہ ۴۴ - امیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ’’میر اعلا علی کے فرزند میر انیس مصحفی کے شاگرد ہوئے‘‘ یہ غلط ہے میر انیس مصحفی کے شاگرد کبھی نہیں ہوئے۔

صفحہ ۴۹ - ’’مرغ نامہ مرزا تقی‘‘ کو مختصر اور چھوٹی سی مثنوی سمجھنا بھی عجیب سا ہے۔ مصحفی کی سب سے مختصر مثنوی قوم شیخ، ہے لیکن اس میں بھی تیس اشعار ہیں۔

صفحہ ۵۰ - ’’عیشی نے اپنے دیوان میں مصحفی کو اپنا استاد لکھا ہے‘‘۔ عیشی کا دیوان فقیر کی نظر سے گزر چکا ہے، اس میں کہیں عیشی نے مصحفی کو اپنا استاد نہیں لکھا۔

صفحہ ۵۳ - ’’مہدی نواب وزیر مرحوم کی حیات میں مصحفی کے شاگرد ہوئے‘‘۔ مہدی مصحفی کے شاگرد نہ تھے، ان کا حال ریاض الفصحا میں موجود ہے لیکن شاگردی کا کہیں تذکرہ نہیں، مصحفی کچھ دنوں ان کے یہاں ملازم ضرور رہے تھے ان کی شان میں مصحفی نے قصاید بھی لکھے ہیں جو فقیر کی نظر سے گزر چکے ہیں، مصحفی نے ان کو اپنا شاگرد نہیں لکھا لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں مستفیضان مصحفی میں شمار کیا ہے، فقیر کے خیال میں ان کا شاگرد ہونا مشکوک ہے، یہ ٹھیک ہے کہ آخری زمانے کے بعض شاگرد ایسے ہیں جیسے مظفر علی اسیر، شہیدی وغیرہ جن کا ذکر مصحفی نے نہیں کیا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تکمیل تذکرۂ ریاض الفصحا کے بعد شاگرد ہوئے تھے۔ مہدی سے سلسلۂ ملازمت دوران تالیف تذکرہ میں قایم ہو چکا تھا، اگر شاگرد ہوتے تو مصحفی ضرور تذکرہ کرتے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ تکمیل تذکرہ کے بعد اصلاح لی ہو گی لیکن یہ بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ سعادت علی خاں کے انتقال کے چند ہی سال بعد مہدی علی خاں نے آغا میر وزیر غازی الدین حیدر (جانشین سعادت علی خاں) کے ظلم سے تنگ آکر لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔

صفحہ ۹۰۔ آسی صاحب نے "مثنوی مودی خانہ" کا تعلق شاہ عالم سے بتایا ہے حالانکہ یہ مثنوی سلیمان شکوہ سے متعلق ہے شاہ عالم سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ صفحہ ۹۲۔ آسی صاحب لکھتے ہیں کہ "آبرو کی مثنوی کا وجود نہیں صرف نام باقی ہے" آبرو کی مثنوی "موعظت معشوق" عرصہ ہوا جناب مرزا فرحت اللہ بیگ "اردو" حیدرآباد میں شایع کر چکے ہیں۔ یہ وہی مثنوی ہے جس کا ذکر قایم نے "مخزن نکات" میں کیا ہے۔ صفحہ ۱۰۶۔ آسی صاحب نے یہ مثنوی سودا کی طرف منسوب کی ہے

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید   صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

یہ مثنوی سودا کی نہیں، سودا کے شاگرد قایم کی ہے، ثبوت کے لئے یہ چند دلیلیں کافی ہوں گی۔

(۱) کلیات قایم کے قلمی نسخہ میں یہ مثنوی موجود ہے، (۲) میر حسن اور قدرت اللہ شوق جیسے معتبر تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں اس مثنوی کو قایم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ دونوں تذکرے سودا کی زندگی ہی میں لکھے گئے ہیں، یہ خیال رہے۔ اس کے علاوہ سودا کے ان قلمی دواوین میں یہ مثنوی نہیں پائی جاتی جو اس کی زندگی میں لکھے گئے اور ان نسخوں میں بھی اس کا پتہ نہیں جو اس کی وفات کے پس و پیش مرتب ہوئے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قایم کی مثنوی سودا کے پاس اصلاح کے لئے آئی سودا نے اصلاح دی لیکن واپس نہ ہوئی مرتب دیوان (غلام احمد) جب دیوان سودا مرتب کرنے لگے تو اس میں اسے بھی داخل کر دیا۔

صفحہ ۱۳۲۔ حسرت صاحب نے لکھا ہے کہ "مصحفی غزلیں بیچتے تھے اچھے اشعار دوسرے لے لیتے تھے اور برے خود اپنے لئے رکھ چھوڑتے۔" یہ غلطی شروع شروع آزاد مرحوم سے ہوئی پھر اور لوگوں نے آنکھیں بند کر کے نقل کرنا شروع کیا۔ اسی صفحہ پر حسرت نے ناسخ کو مصحفی کا شاگرد بنا دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

تمام مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپ مضمون جناب مشیر احمد علوی کا "مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں" ہے اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون لکھ کر مشیر صاحب نے آرٹ پیدا کرنا چاہا ہے لیکن اس مضمون کو شایع کر کے آپ نے آرٹ کی تکمیل کر دی ہے۔

اگر مجھے دھوکا نہیں ہو رہا ہے (جس کی امید کم ہے) تو میں یہ کہہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ "مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں" جعل کا بہترین نمونہ ہے اور "ید بیضا" اور "نور ازل" جناب مشیر کے بحر تخیل کی صرف موجیں ہیں اور بس! مضمون دلچسپ یوں زاید ہو جاتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ واقعات کی بے ربطی، سنین کی غلطی، اور بیانات کے الجھاؤ سے پورا مضمون بھرا پڑا ہے اور ان ہی بیانات نے مشیر صاحب کا بنا بنایا قلعہ مسمار کر دیا ہے۔

سب سے پہلے جناب مشیر احمد کی تمہید ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اسے میں جناب مشیر کی عبارت سمجھوں یا مولانا عبدالحق بی۔ اے کی۔ جب آپ میری طرح مصحفی کے کسی ایک تذکرہ کے مقدمہ کو اٹھا کر پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے، پورے مضمون میں بمشکل چند سطریں جناب مشیر کی اپنی ہوں گی، کچھ مصحفی کی عبارتوں کے ترجمے ہیں اور

کچھ مولانا عبدالحق کے مقدمہ کی ترمیم۔

شاعری کا ستارہ اودھ میں اسوقت چمکا جبکہ تیموری اقبال لب بام تھا اور شاعری رفتہ رفتہ ایک پیشہ ہو کر رہ گئی تھی، اور اس عصر کے شاعر متاعِ ہنر کو کاسۂ گدائی بنائے ہوئے دربدر آوارہ گردی کرتے تھے۔ مشیر احمد علوی - مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں صفحہ ۱۴۱	اُردو شاعری کا ستارہ اسوقت چمکا جبکہ سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب گہنا رہا تھا، رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہو گئی اور اس عہد کے باکمال سخنور اپنے متاعِ ہنر کو دربدر لئے پھرتے تھے۔ مولانا عبدالحق بی۔اے مقدمہ تذکرۂ مصحفی صفحہ الف
ضروریاتِ زندگی کے ذرائع محدود تھے، شعرا بصد حسرت و یاس پورب کی طرف چل کھڑے ہوئے اور وادیِ غربت میں قدم رکھا۔	بسر اوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے ناچار اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح دل پر پتھر رکھکر دلی کو خیرباد کہا اور وادیِ غربت میں قدم رکھا۔
بیت السلام کی حالت خواہ کتنا ہی ابتر کیوں نہ رہی ہو... ...اس نے اپنے دلوں پر پتھر رکھ کر عزیز وطن کو خیرباد کہا مگر عمر بھر یہ داغ مفارقت نہ مٹا۔ صفحہ ۱۴۰	دلی کی حالت اسوقت کیسی ہی ہو اس کا چھوڑنا آسان کام نہ تھا وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے.... لیکن مرتے دم تک اس کا داغ دل سے نہ مٹا۔ صفحہ ج
مصحفی کو دربار میں گئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ درباری حسد و رشک رقابت و غمازیاں... عیاریاں اور افترا پردازیاں... استعمال ہونے لگیں۔	ہمارے درباروں میں حسد و رشک، رقابت و غمازی.... عیاریاں اور افترا پردازیاں کام میں لائی جاتی ہیں۔
انشاء، جرأت، مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے، اول اول شاعرانہ چشمک رہی بعد میں یہ رنگ جنگ و جدال اور فحش تک پہونچ گئی ہزلیات میں مصحفی اور انشاء نے وہ کیچڑ اچھالی کہ تہذیب نے آنکھیں نیچی کرلیں۔	انشاء، جرأت اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے اول اول شاعرانہ چشمک رہی بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدل اور فحش اور پھکڑ تک پہونچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاء نے وہ کیچڑ اُچھالی کہ تہذیب نے آنکھیں نیچی کرلیں۔
....نواب وزیر، صاحب عالم نے بھی اس میں حصہ لیا اور لطف اندوز ہوئے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشاء اپنی طراری تیزی اور شوخی سے بازی لے گئے۔ صفحہ ۱۴۳	....جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لینے لگے اور شہر والوں کو ایک دل لگی ہاتھ آگئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشاء اپنی طراری تیزی اور شوخی سے بازی لے گئے صفحہ ہ
مصحفی کے اُستاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، بڑے مشاق اور ریختہ گو شاعر تھے، آٹھ دیوان متعدد قصاید اور مثنویاں انھوں نے تصنیف کیں۔ نگار مصحفی نمبر صفحہ ۱۴۲	مصحفی کے اُستاد ہونے میں شبہ نہیں بڑے مشاق اور ریختہ گو شاعر تھے آٹھ دیوان، متعدد قصاید اور مثنویاں انکی تصنیف سے ہیں صفحہ و — مقدمہ تذکرۂ مصحفی شائع کردہ انجمن ترقی اُردو

یہ تو تمہید کا حال ہے اب آئیے اصل مضمون کی طرف، معلوم ہوتا ہے کہ مشیر صاحب نے مصحفی کے تینوں تذکرے (مطبوعہ) سامنے رکھ لئے اور کچھ کتاب کی مدد سے اور کچھ مولانا عبدالحق کے مقدمہ کی نقل کرکے مضمون تیار کرلیا۔

صفحہ ۱۴۱ - پر مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "سنہ ۱۱۹۰ھ میں سلیمان شکوہ لکھنؤ میں داد عیش دے رہے تھے اور غلام ہمدانی مصحفی دربار سے منسلک تھے"۔ سنہ ۱۱۹۰ھ میں تو شاید سلیمان شکوہ ایام رضاعت میں ہوں گے لکھنؤ میں ٹھیکر داد عیش کیا دیتے مصحفی بھی سنہ ۱۱۹۰ھ کے بعد کہیں آئے ہیں اور سلیمان شکوہ کے دربار میں منسلک ہوئے ہیں یہ زمانہ سنہ ۱۲۰۵ھ سے ۱۲۰۷ھ یا سنہ ۱۲۰۹ھ تک محدود ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۲۰۹ھ میں مصحفی کو دربار میں جگہ ملی"۔ سنہ ۱۲۰۹ھ کی تخصیص کی مضمون نگار کے پاس کیا دلیل ہے؟ سلیمان شکوہ سنہ ۱۲۰۸ھ میں لکھنؤ پہونچے تھے قطعی طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ مصحفی کس سنہ میں سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔

صفحہ ۱۴۰ - "نواب وزیر اودھ جھیل ہلاتے تھے اشرفیاں پاتے تھے"۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے مضمون نگار کا کیا مطلب ہے۔ قاعدہ تو یہ تھا کہ امرا اشرفیاں نذر پیش کیا کرتے تھے اور بادشاہوں اور شہزادوں کی طرف سے خلعت ملتا تھا۔ مضمون نگار کی اگر ان لفظوں سے کچھ اور مراد ہے تو ہو لیکن کم از کم اس عبارت سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۴۱ - "نواب وزیر اور صاحب عالم نے بھی اس میں حصہ لیا"۔ کوئی معتبر ثبوت؟

صفحہ ۱۴۲ - "ناسخ اسی دبستان کے پروردہ یافتہ تھے"۔ مضمون نگار کا یہ بیان صحیح نہیں!

اب تذکرہ شروع ہوتا ہے شروع میں (بقول جناب مشیر) مصحفی کا مقدمہ ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مقدمہ کی یہ عبارت تذکرۂ ہندی کی عبارت کی نقل ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ مصحفی فارسی نثر لکھنے سے اتنا عاجز تھے کہ چند سطریں دوسری نہیں لکھیں بلکہ اپنی دوسری تصنیف کی لکھی ہوئی سطریں نقل کر دیں۔ دونوں عبارتیں ملاحظہ ہوں:-

بتکلیف عزیز از جان لالہ کانجی مل صبا قوم کایتھ سکسینہ کہ وطن بزرگانش فیروزآباد و وجودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ فرمانش تذکرۂ ہنود نمودند۔ فقیر در ایامے کہ وارد ایں شہر بود چندے حسب اتفاق بر محل سرائے ایشاں اقامت داشت، مشار الیہ دراں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ شعرے کہ بہ زبان خود می گفت آں را بہ نظر فقیر باعتقاد تمام می گزارند۔۔ طبعش بہ خیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عرش و نامی کردن زیادہ ازیں قدم بہ جادہ ترقی می نہاد اما حیف کہ بعمر بست و پنجم سالگی در عین عالم شباب مدقوق شدہ در گزشت۔ و داغ حسرت بر دل باقی ماندگان نہاد۔ الغرض شوق شعر ہندی دامن دلش را بہ حکم فرا گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں وادی پرخار

لالہ کانجی مل صبا قوم کایتھ سکسینہ وطن بزرگانش فیروزآباد وجودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ۔ فقیر در ایامے کہ وارد ایں شہر بود چندے حسب اتفاق بر مکان ایشاں اقامت داشت، مشار الیہ دراں ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ چیزے کہ بہ زبان خود می گفت آنرا از نظر فقیر باعتقاد تمام می گزرانید۔۔ ۔۔۔۔ طبعش بخیال شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش وفا می کرد زیادہ ازیں قدم بر جادۂ ترقی می نہاد اما حیف کہ بعمر بست و پنجم سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ در گزشت و داغ حسرت بر دل باقی ماندگان نہاد"

تذکرۂ ہندی مصحفی صفحہ ۱۴۱

... شوق شعر ہندی دامن دلش را بحکم گرفتہ طوعاً و کرہاً قدم دریں

گزاشت "   مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں صفحہ ۱۴۱
وبقید حروف تہجی اسامی شعرائے ہنود ہمت گماشت ۔
(صفحہ ۱۴۴ ۔ نگار)

بادیہ پرخار گزاشت، و بہ قید حروف تہجی اسامی شعرائے . . .
. . . . ہمت گماشت ۔
(تذکرہ ہندی صفحہ ۳ و ۴)

دیکھا آپ نے ! چند سطروں کے لئے مشیر صاحب کو کتنا تکلف کرنا پڑا ہے، تذکرہ کی وجہ تصنیف لکھنا ضروری ہے یہ نہیں سکتے تھے کہ وجہ تصنیف مصنف نے نہیں لکھی، اگر چند سطریں فارسی کی خود لکھ لیتے تو چودھویں صدی کی فارسی ہو جاتی اور انھیں دکھانا تھا کہ یہ تذکرہ بارھویں صدی میں لکھا گیا، اس لئے سب سے آسان صورت یہ سمجھی کہ مصحفی ہی کی عبارتوں سے مختلف ٹکڑے جوڑ کر چند سطریں بنا لی جائیں چنانچہ آپ اگر مصحفی کے مطبوعہ تذکروں سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلیگا کہ "بتکلیف از جان" سے " در گزشت" تک تذکرہ ہندی صفحہ ۱۴۱ سے " داغ حسرت بر دل باقی ماند تا گاں نہ بار" تذکرہ ہندی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور سے اور " شوق شعر ہندی " سے " ہمت گماشت " تک تذکرہ ہندی صفحہ ۲ (مقدمہ مصحفی) سے لیا گیا ہے ۔

لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو پتہ چلیگا کہ کہیں کہیں پر ہلکا سا فرق بھی کر دیا ہے۔

(۱) اصل نسخہ میں ہے " خود ش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ "۔ مشیر صاحب نے اس میں ترمیم کر دی " وجود ش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ "۔ (۲) " نشو و نما یافتہ " کے بعد " فرمایش تذکرہ ہنود نمودند " ٹھونس دیا گیا، شاید یہ سمجھے کہ ضرورت نہیں محسوس کی کہ " نمودند " کا فاعل کون ہوگا۔ (۳) " بر مکان ایشاں " کی جگہ " بر محل سرائے ایشاں " شعرے کہ بہ زبان خود می گفت " کی جگہ " چیزے کہ بہ زبان خود می گفت " " در عین جوانی " کی جگہ " در عین عالم شباب " لکھ دیا گیا ہے

دوسرے تذکرہ کا نام " نور ازل " بتایا جاتا ہے افسوس ہے کہ مضمون نگار نے وجہ تصنیف نہیں لکھی نہ مقدمہ کی کچھ عبارت نقل کی اور یہ اچھا بھی ہوا ورنہ چند سطروں کے لئے پھر ہنگامہ کرنا پڑتا اور مشیر صاحب کو مفت کی زحمت اٹھانی پڑتی تاریخ تحریر ۱۲۰۹ھ لکھی ہے اور مزید شہادت کے لئے مصحفی کا قطعۂ تاریخ بھی نقل کر دیا ہے۔

سال او چوں ز خود بہ پرسیدم   یک ہزار و دو صد و نُہ بنوشت

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے تذکرہ ہندی میں بھی یہی قطعۂ تاریخ دیکھا، یہ کسی طرح ماننے جانے کے قابل نہیں کہ مصحفی نے (جو معمولی سی معمولی باتوں پر قطعہ لکھنے کے لئے طیار رہتے تھے) اپنی ایک تصنیف کے لئے قطعۂ تاریخ نہیں لکھا، اور وہ قطعۂ تاریخ جو دوسری کتاب کے لئے لکھ چکے تھے اسی کو نقل کر دیا۔

افسوس ہے کہ مقالہ نگار نے ان تذکروں پر کافی روشنی نہیں ڈالی، لیکن مختصراً جو کچھ تذکروں کے متعلق لکھا ہے اس میں بھی چند باتیں ایسی آجاتی ہیں جن کا مقالہ نگار کے پاس شاید کوئی جواب نہ ہوگا مثلاً یہ کہ :-

(۱) " تذکرۂ ید بیضا " میں دوسرا نام گوربخش ادیب کا ہے " یہ تذکرہ ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ

گوہر بخش ادیب جو تقریباً ۱۲۱۵ھ میں مصحفی کے شاگرد ہوئے ہیں ان کا ذکر شاگرد کی حیثیت سے ۱۲۰۲ھ میں کیونکر درج ہو سکا۔ (۲) قتیل کے حال میں لکھا ہے کہ "وہ دریائے لطافت کی ترتیب میں انشا کے شریک تھے"، دریائے لطافت ۱۲۲۰ھ کے بعد تقریباً ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی ہے براہ کرم مجھے بتایا جائے کہ ۱۲۲۲ھ کے واقعات پندرہ بیس سال قبل ۱۲۰۲ھ میں کیسے لکھے جا سکے۔ (۳) مرزا تقی ہوس کے بیان میں لکھا ہے کہ "ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہوگی" واضح رہے کہ یہ تصنیف ۱۲۰۹ھ کی ہے۔ ۱۲۰۹ھ میں ان کی عمر چالیس سال ہے اور آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی جب آپ مصحفی کے تذکرہ ریاض الفصحا مرتبہ ۱۲۳۶ھ میں بھی دیکھیں گے "عمرش از چہل متجاوز خواہد بود" معلوم نہیں ہوس نے کس قسم کی گولیاں کھائی تھیں کہ ۱۲۰۹ھ میں بھی چالیس برس کے تھے اور ۱۲۳۶ھ میں بھی چالیس ہی برس کے۔

اصل یہ ہے کہ مشیر احمد صاحب نے یہ تمام حالات مصحفی کے تینوں تذکرے خصوصاً عقد ثریا سے لئے ہیں اور عبارت تقریباً وہی نقل کر دی ہے یہاں تک کہ بعض تو صاف ترجمہ معلوم ہوتی ہیں اور ان دو بیاضوں کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصحفی عبارتیں لکھنے سے عاجز تھے (اور قطعات بھی)

مجھے مزہ وہاں پر آیا جہاں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "انتخاب کوئی نہیں دیا"، حالانکہ اس کی اصل یہ ہے کہ یہ حالات مضمون نگار نے عقد ثریا سے لئے اور عقد ثریا کے مطبوعہ نسخہ میں نمونہ کے اشعار نہیں ملے، عقد ثریا کے قلمی نسخوں میں اشعار موجود ہیں لیکن مطبوعہ میں نہیں کیونکہ عبدالحق صاحب نے قصداً اشعار نہیں رکھے کہ فارسی کے تھے اسی سلسلہ میں اگر تذکرہ مسرور کا ذکر کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

صفحہ ۸۵ پر امیر احمد صاحب علوی لکھتے ہیں کہ مسرور کاکوروی نے ایک تذکرہ ۱۲۳۹ھ میں لکھا اور مزید شہادت کے لئے خاتمہ کی عبارت بھی نقل کر دی لیکن میری طرح آپ کی حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہے گی جب دیکھیں گے کہ یہ عبارت مصحفی کی تذکرہ ہندی کے خاتمہ کی ہے۔ صرف کہیں کہیں ہلکا سا اختلاف کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

خاتمہ تذکرہ مسرور	خاتمہ تذکرہ ہندی مصحفی
بر ضمیر آئینہ نظیر مبصران گوہر معنی مخفی نماند کہ مولف ایں	بر ضمیر آئینہ نظیر مبصران گوہر معانی مخفی... نماند کہ مولف ایں
بیاض "صبح ازل" شیخ پیر بخش مسرور ولد حکیم حیات اللہ...	تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد...... کہ بہ مصحفی
کہ بہ تخلص مسرور شہرت دارد و از سبب نامساعدت روزگار	شہرت دارد و از سبب...... نامساعدتِ زمانہ
کجا فرصت آں داشت کہ بہ تفحص و تجسس احوال شعرائے نامدار	کجا فرصت آں داشت کہ بہ تصحیح احوال.... شعرائے سابق..
پرداز د لیکن بہ رہبری علامہ دہر استادی غلام ہمدانی مصحفی....	پرداختہ... اما اکنوں کہ بہ رہبری.... مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر
ایں بیاض را..... صاف نمودہ و درست ساختہ....	تذکرہ را..... صاف نمودہ و درست ساختہ.....

بطور بیاض تحریر یافتہ"	بطور بیاض ۔۔۔ تحریر یافتہ"
خاتمہ تذکرہ مسرور مضمون مولوی امیر احمد علوی (نگار) ص ۵۴	خاتمہ تذکرہ ہندی مصحفی (انجمن ترقی اردو) ص ۲۸۲

قطعۂ تاریخ یہ ہے ؎

سال او چوں ز خرد پرسیدم   یک ہزار و دو صد سی و نہ بنوشت (۱۲۳۹ھ)

دیکھا آپ نے ! قطعۂ تاریخ کا یہی ایک شعر ہے جو تمام گردش کر رہا ہے، مصحفی نے تذکرۂ ہندی کے اختتام پر یہی قطعۂ تاریخ لکھا (ملاحظہ ہو تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۸۲) مصحفی نے بیاض "نورازل" کے اختتام پر بھی یہی قطعہ تاریخ لکھا (ملاحظہ ہو نگار صفحہ ۱۴۲) مصحفی کے لائق شاگرد مسرور کے تذکرہ کا بھی قطعۂ تاریخ یہی ہے (ملاحظہ ہو نگار صفحہ ۵۴) معلوم نہیں جناب امیر احمد علوی اور جناب مشیر احمد علوی کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے شاید یہ توارد ہو لیکن اگر توارد ہے تو نہایت دلچسپ ہے حیرت ہے کہ نہ صرف مسرور کا قطعۂ تاریخ مصحفی کے قطعۂ تاریخ سے لڑ گیا ۔ بلکہ خود مصحفی کا قطعۂ تاریخ ان کے ایک قطعۂ تاریخ سے لڑ گیا ۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ مسرور کے قطعۂ تاریخ میں ہلکا سا اختلاف ہے اور یہ اختلاف ناگزیر تھا ۔ مصحفی کا مصرعہ ہے :-

یک ہزار و دو صد و نہ بنوشت

یہ تو ۱۲۰۹ھ ہوا ، انھیں ۱۲۳۹ھ ثابت کرنا ہے اس لئے بڑی آسانی سے مصرع میں "سی" ٹھونس دیا گیا اور مصرع ہو گیا

یک ہزار و دو صد سی و نہ بنوشت

مصرع ناموزوں ہو گیا ، لیکن اس کا خیال نہ جناب مسرور کا کوروی تلمیذ علامہ مصحفی کو ہوا نہ مرتب تذکرہ جناب مشیر احمد علوی کو اور نہ فاضل مضمون نگار جناب امیر احمد صاحب علوی کو ۔

مختار الدین احمد آرزو

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کریں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :- (۱۹۲۶ء) جنوری ۵/- (۱۹۲۷ء) اپریل ۴/- (۱۹۳۰ء) مئی ۴/- (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴/ فی پرچہ - (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۴/ فی پرچہ (۱۹۳۳ء) فروری و جولائی ۴/ فی پرچہ - (۱۹۳۴ء) فروری و اکتوبر ۴/ فی پرچہ (۱۹۳۵ء) فروری، اپریل تا اگست، اکتوبر تا دسمبر ۵/ فی پرچہ - (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵/ فی پرچہ - (۱۹۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۸/ فی پرچہ -

منیجر نگار

اگر جنگ چھڑ گئی تو ؟

یہ ایک سوال ہے جو اس وقت دُنیا کی ہر قوم کو مضطرب بنائے ہوئے ہے اور اس لئے ہم کو بھی اپنی جگہ غور کرنا چاہئے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔

اس مسئلہ کے متعدد پہلو ہیں بعض داخلی بعض خارجی اور ان میں سے ہر ایک مستقل گفتگو کا محتاج ہے۔ خارجی پہلو کی بحث میں ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اسوقت یوروپ کی سیاسیات کا کیا رُخ ہے، برطانیہ کا موجودہ پوزیشن کیا ہے، دُنیا امن جنگ کے لئے کیا کیا طیاریاں کر رہی ہے، ہندوستان کی اہمیت آیندہ جنگ میں کیا ہو سکتی ہے اور اس پر حملہ کئے جانے کے کیا کیا اور کس طرح کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ داخلی پہلو کی گفتگو میں ہم کو غور کرنا ہوگا کہ ہماری ملکی تحریکات کا کیا رنگ ہے، ہماری موجودہ پالیسی کیا ہے اس میں کسی تغیر کی ضرورت ہے یا نہیں، کن کن ملکوں کی طرف سے حملہ کا امکان ہے اور یہ کہ ہم بیرونی حملوں کی مدافعت کیونکر کر سکتے ہیں۔

ان تمام مسایل پر پروفیسر ادر کار نے ایک نہایت مفید و بسیط کتاب شایع کی ہے چنانچہ ہم پروفیسر مذکور کے نظریوں کو پیش کر کے ان پر ایک بسیط تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

آیندہ جنگ کب شروع ہوگی ؟ اس آگ کے اشتعال کا سبب کیا ہوگا ؟ اور ہندوستان پر اس کا کیا اثر پڑیگا ؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا قطعیت کے ساتھ تو کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، لیکن قریب قریب یقین کے ساتھ ہم کسی نتیجہ پر ضرور پہونچ سکتے ہیں۔

برٹرنڈ رسل نے خوب لکھا ہے کہ عالمگیر جنگ کا خوف ہی اصل سبب عالمگیر جنگ کا ہے، لڑائی کے خوف نے اسلحہ سازی بڑھا دی ہے، اسلحہ سازی جنگ کے خوف کو بڑھا رہی ہے اور آخر کار یہی خوف ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کرے گا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں دنیا کی خاص خاص قوموں کا تین ہزار ملین پونڈ (تقریباً ۴۰ ارب روپیہ) ہلاکت بار اسلحہ جنگ کی طیاری پر صرف کرنا اس خوف کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور ایچ۔ جی۔ ویلز کی یہ پیشین گوئی کہ ۱۹۴۰ء میں جنگ شروع ہو جائے گی بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ جنگ اسوقت تک شروع نہ ہوگی جب تک دونوں فریق اس کے لئے طیار نہ ہوں اور انگلستان جسے یقیناً ایک فریق بننا ہے ابھی تک طیار نہیں ہے اور اس کی یہ طیاری سنہ ۴۰ء سے پہلے مکمل نہ ہوسکے گی اس دوران میں بعض ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ پچیس سال قبل ان سے دنیا میں آگ لگ جاتی لیکن شیر برطانیہ نے ان سب کو برداشت کیا اور سوائے غرّانے یا دُم ہلا دینے کے کوئی جنبش نہیں کی۔

رہائن لینڈ میں جرمنی کے فوجی استحکامات، حبش پر اٹلی کا قبضہ، بحرِ روم میں برطانوی جہازوں پر حملے، شنگھائی کے واقعات، یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر برطانیہ چوکھی لڑنے کے لئے طیار ہوتا تو کبھی کی جنگ شروع ہوگئی ہوتی۔ تقریباً یہی حال وسطی یوروپ کی حکومتوں کا ہے اور وہ بھی جنگ کے لئے طیار نہیں ہیں۔ حبشہ کی مہم نے اٹلی کو کافی خستہ کر دیا ہے اور وہ بھی اسوقت تک جنگ کی ہمت نہیں کر سکتا جب تک اسپین میں جنرل فرانکو کامیاب ہوکر پوری طرح فاسسٹی اقتدار قایم نہ کر دے۔ اس کے لئے بھی ایک سال کی ضرورت ہے۔ رہا جرمنی سو اسکی تدابیر بھی ابھی تک پختہ نہیں ہوئیں۔ اس کی ہوائی طاقت اس میں شک نہیں بڑی زبردست ہے، لیکن وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ پہلے اسپین میں نازی و فاسسٹی اثر قایم ہوجائے تاکہ فرانس کو اس طرف سے دبا سکے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مقصد روس ہے۔ جرمنی یہ چاہتا ہے کہ اس طرف تھوڑی فوج اور معمولی استحکامات کے ذریعہ سے برطانیہ و فرانس کو اُلجھائے رکھے اور دوسری طرف پوری قوت کے ساتھ روس پر حملہ کر دے اور چونکہ اس کے لئے اُسے جاپان کی مدد حاصل کرنا ضروری ہے اس لئے جب تک چین کے ساتھ اس کا اُلجھاؤ ختم نہ ہو، جرمنی اپنے حقیقی ارادوں کی تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔ الغرض ان حالات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کا فوری امکان نہیں ہے لیکن سنہ ۴۰ء سے زیادہ یہ ملتوی بھی نہیں ہوسکتی، کیونکہ اسوقت تک برطانیہ کی جنگی طیاریاں بھی پوری ہوجائیں گی اور ادھر جاپان و اسپین کے معاملات بھی طے ہوچکیں گے۔

رہا یہ سوال کہ جنگ کے آغاز کا بہانہ کیا ہوگا، سو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، لڑنے کے سو بہانے ہاتھ آجاتے ہیں۔ تاہم قیاس یہی کہتا ہے کہ روکرین اور شرقی سائبیریا جنگ کا اکھاڑا ہوگا۔

اس وقت زیکوسلوویکیا کے درمیان سے جو سڑک موٹر کی نکالی جارہی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جرمن فوجیں آسانی سے روکرین تک پہونچ سکیں۔ نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس راستہ میں اگر کسی کی طرف سے مزاحمت ہوسکتی ہے تو وہ رومانیا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے مزاحمت کی تو کیا نتیجہ ہوگا، چنانچہ گزشتہ دسمبر میں جب شاہ رومانیا ہر ہٹلر سے ملکر واپس آیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ ہٹلر کی مخالفت نہیں کر سکتا کیونکہ یہودیوں پر اب رومانیا میں بھی سختی ہونے لگی ہے اور بالکل فاسسٹی اُصول پر فوجی تنظیم ہورہی ہے۔

الغرض جسوقت یہ ابتدائی طیاریاں مکمل ہوجائیں گی تو جنگ کا آغاز یوں ہوگا کہ اس طرف سے جرمنی اور

سائبیریا کی طرف سے جاپان روس پر حملہ کرے گا اور اس طرح دو مختلف محاذوں پر بالشویک فوجوں کو کام کرنا پڑیگا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت میں فرانس کیا کرے گا۔ اول تو اس معاہدہ کی بنا پر جو روس و فرانس کے درمیان ہو چکا ہے، فرانس کو روس کی مدد کرنا ضروری ہے، دوسرے سیاسیات کا اقتضا بھی یہی ہے کہ فرانس، روس کا ساتھ دے، اس صورت میں برطانیہ اور اٹلی کا جنگ میں حصہ لینا ضروری ہو جائے گا یعنی برطانیہ کو فرانس کا ساتھ دینا ہوگا اور اٹلی کو جرمنی کا۔

برطانیہ اگر چاہے بھی تو وہ نیوٹرل نہیں رہ سکتا کیونکہ اس صورت میں سخت سوشلسٹ انقلاب کا اندیشہ ہے اور فرانس کا ساتھ دینا اسکے لئے ضروری ہے، رہا اٹلی سو یہ بات ظاہر ہے کہ نازی اور فاسسٹ عقاید دونوں متحد ہیں، اور مسولینی ہر ہٹلر کا ساتھ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بہرحال آیندہ جنگ میں ایک طرف روس، فرانس اور برطانیہ ہوں گے اور دوسری طرف اٹلی، جرمنی اور جاپان اور اس کے معنے یہ ہیں کہ ساری دُنیا میں یہ آگ بھڑک اُٹھے گی۔

اس موقعہ پر ہمیں اس سے بحث کی ضرورت نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا، بلکہ صرف یہ غور کرنا ہے کہ ہندوستان کا کیا حشر ہوگا؟

چونکہ ہندوستان، برطانیہ عظمیٰ کا حصہ ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ برطانیہ جنگ میں مبتلا ہو اور ہندوستان نیوٹرل بنا رہے، علاوہ اس کے ہندوستان کا جائے وقوع ایسا نہیں کہ وہ حملہ سے بالکل محفوظ رہے۔ یہ تقریباً طے شدہ امر ہے کہ آیندہ جنگ میں جاپان اور اٹلی برطانیہ پر حملہ کریں گے اور برطانیہ پر حملہ کرنے کے معنے ہندوستان پر حملہ کرنا ہے۔

اٹلی کے لئے حملہ کی راہ بحر روم، مشرق ادنیٰ و مشرق وسطیٰ ہے۔ لیکن اس کے لئے اٹلی بالکل طیار ہے۔ اسوقت اس کی ۷ لاکھ سپاہ اور ہوائی جہازوں کی بڑی تعداد بحر روم کے سواحل پر اریٹریا اور حبشہ میں موجود ہے، لڑائی شروع ہوتے ہی ایک طرف اٹلی کے بمبار ہوائی جہاز ہندوستان کے مغربی سواحل تک پہونچکر کراچی، بمبئی اور کوچین پر آگ برسانے لگیں گے اور دوسری طرف اس کی آبدوز کشتیاں تجارتی جہازوں کو غرق کر دینا شروع کر دیں گی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اطالوی فوجیں پہلے سندھ یا گجرات میں اُتریں گی اور یہیں سے وہ چاروں طرف پھیل کر قابض ہوتی جائیں گی۔ سندھ کی موزونی کا سبب یہ ہے کہ اس کے شمالی و مشرقی ریگستان نے اسکو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا ہے جہاں سے صرف دو ریلوے لائن گزرتی ہیں ایک پنجاب کو دوسری گجرات کو۔ ان لائنوں کو نہایت آسانی سے بیکار کیا جا سکتا ہے، اور یہاں کی آبادی جو کم بھی ہے اور غیر جنگجو بھی فوراً اطاعت قبول کر سکتی ہے

علاوہ اس کے خام پیداوار بندرگاہوں کی تعمیر کے لحاظ سے بھی یہ حصۂ زمین بہت موزوں ہے۔

جاپان کا حملہ ہندوستان پر اگرچہ ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہوگا، کیونکہ آیندہ جنگ میں اس کی فوجیں ایک طرف سائبیریا میں مصروف رہیں گی اور دوسری طرف چین پر تصرف و اقتدار قایم رکھنے کے لئے بڑی تعداد یہاں رکھنا پڑے گی۔ برما کی حدود کی طرف سے بھی وہ اسوقت تک اقدام نہیں کرسکتا جب تک وہ درمیانی حکومتوں کو مغلوب نہ کرلے، الغرض وہ بری یا بحری تاخت تو فی الحال ہندوستان پر نہیں کرسکتا لیکن ہوائی تاخت ضرور کرے گا اور برما، ہندوستان اور فرانسیسی انڈوچائنا کے خاص خاص شہروں پر بمباری کرکے برطانیہ اور فرانس کے دل میں دھڑکا ضرور پیدا کرتا رہے گا۔

لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ ہندوستان سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ برخلاف اس کے اس کا عین مقصود ہندوستان پر قبضہ کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سمرقند کی طرف سے آنے والی مٹھی بھر زرد رنگ والی قوم کے افراد نے کس طرح صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مغلوں ہی کی ایک شاخ (ترکوں) نے کیونکر مصر اور مشرق ادنیٰ پر عرصۂ دراز تک اپنا ہلالی پرچم لہرایا اور اس لئے وہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ جن ممالک پر زرد رنگ کی اقوام حکومتیں کرچکی ہیں وہاں اس کی حکومت بھی قایم ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ تحمل شناس بھی ہے اور اپنی خواہشوں سے مغلوب ہوکر قبل از وقت کوئی اقدام نہیں کرے گا۔

اب دیکھنا چاہئے کہ ان خطرات کا مقابلہ ہندوستان کیونکر کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج تک مصائب و خطرات کا مقابلہ کبھی دعا سے نہیں ہوسکا اور دنیا کی کوئی ریاضت، کوئی تپسیا ایسی نہیں جو حوادث کا مقابلہ کرسکے۔ اسوقت تک خدا جانے کتنے اولیا اور انبیا پیدا ہوئے، لیکن جنگی تباہیوں کی مقاومت کے لئے وہ کوئی معجزہ پیش نہ کرسکے۔

مادی قوت کا مقابلہ مادی ذرایع ہی سے کرنا ہوگا اور اس حیثیت سے ہماری حالت بہت گری ہوئی ہے جہاں تک جنگی معلومات یا عسکری جرأت و بسالت کا تعلق ہے ہماری یہ حالت ہے کہ دس فی صدی آبادی نے تو آج تک اسلحہ کی صورت ہی نہیں دیکھی اور ہزار میں ایک ایسا ہوگا جس نے کبھی بندوق کو ہاتھ لگایا ہو۔ اور تو اور ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کو ابتک توپخانوں کا کوئی علم نہیں ہے اور عہد حاضر کی میکانکی جنگ سے وہ بالکل ناواقف ہیں۔ گزشتہ جنگ میں فلینڈرس کے مقام پر سب سے پہلی مرتبہ یہاں ہندوستانی فوجوں کو معلوم ہوا کہ حقیقی جنگ کسے کہتے ہیں، اور نیز یہ کہ اس میں حصہ لینے کی ان کو کوئی تعلیم نہیں دی گئی۔

ہندوستانی فوجوں سے گزشتہ جنگ میں جو کام لیا گیا اس کی داستان بہت دردناک ہے۔ کہر اور مسلسل بارش میں راتیں بسر کرنے کے بعد وہ خندقوں میں ٹھونس دئے جاتے تھے اس حال میں کہ کوئی توپخانہ ان کی حفاظت کے لئے موجود نہ ہوتا تھا اور دشمن کا قریب ترین نشانہ وہی ہوتے تھے۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں ان پر گولے آ آ کر گرتے تھے،

بم برسائے جاتے تھے، زہریلی گیسوں کا شکار ہوتے تھے اور مشین گنوں سے جو گولیوں کی بارش ہوتی تھی اس کا ہدف سب سے پہلے انھیں کو بننا پڑتا تھا۔ لیکن ان تمام تلخ تجربات کے باوجود ابتک ہندوستانی فوجوں کو جنگ کے خاص رموز سے ناواقف رکھا گیا ہے۔ پھر ان حالات میں اگر ہندوستان پر حملہ ہو تو یہاں کی فوجیں کس کام آسکتی ہیں؟۔ اطالیہ کی فوج کے مقابلہ میں ان کا وہی حشر ہوگا جو جاپانی افواج کے مقابلہ میں چینی سپاہیوں کا ہو رہا ہے۔

سب سے بڑا سہارا برطانوی افواج اور برطانوی عسکری سیادت کا ہے، لیکن فرض کیجئے کہ کل ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ انگریز یہاں سے چلے جائیں، یا انگریزی فوجوں کو خود انگلستان کی حفاظت کے لئے چلا جانا پڑے تو کیا ہوگا؟۔ وہی جو ابھی بیان کیا گیا، یعنی یوروپ کی جدید افواج کے سامنے ہماری دیسی فوجیں ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتیں اور سوائے آسانی سے جان دیدینے کے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ علاوہ اس کے برطانوی قوت کا گھمنڈ بھی بڑی حد تک صحیح نہیں، کیونکہ برطانیہ کی فوجی دھاک صرف بحری قوت تک محدود تھی اور اب اس پر اعتماد کرنا ایسا ہی ہے جیسے بندوق کے سامنے تیر و شمشیر پر۔

چارلٹن کہتا ہے کہ اب کسی ملک کا اپنی بحری قوت پر بھروسہ کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے، اسی کے ساتھ نارمن والٹن نے بہ حیثیت ماہر کے برطانیہ کو مشورہ دیا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب برطانیہ کی بحری قوت بھی قصۂ پارینہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب برطانیہ کو بحر روم، بحر احمر، اور نہر سویز کو چھوڑ دینا چاہئے، کیونکہ ان پر اقتدار قایم رکھنا نہ صرف غیر معمولی مصارف کا باعث ہے بلکہ دشوار بھی ہے اسی کے ساتھ وہ یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ فلسطین اور جزایر مالٹا و قبرص کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔

بریگیڈیر جنرل گروز کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسوقت بحر روم کے سواحل پر فرانس اور اٹلی کی دو بڑی زبردست قوتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک مشرق کے ساتھ ہمارے فوجی تعلق کو علحدہ کر سکتی ہے اور مالٹا کا بحری مرکز (Naval base) کوئی کام نہیں دے سکتا۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جسوقت زیکوسلاویکیا کا جھگڑا حال ہی میں پیش تھا تو بحر روم کے برطانوی بیڑے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ مالٹا سے ہٹ کر اسکندریہ اور حیفہ چلا جائے تاکہ اطالوی بمباروں کی دسترس سے قریب نہ رہے اور بندرگاہ کرد مارٹی پر جو بیڑا متعین تھا وہ کسی غیر معلوم جگہ پر بھیجدیا گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر برطانوی مستعمرات اب اپنے بچاؤ کے لئے فوری تدابیر اختیار کر رہے ہیں اور برطانیہ کی قوت پر بھروسہ کرنے کے لئے طیار نہیں۔ چنانچہ شمالی افریقہ اپنے آپ کو بڑی مستعدی سے مسلح کر رہا ہے اور میکانکی طریقۂ مدافعت کے لئے دس ملین پونڈ کی منظوری وہاں دی گئی ہے۔ جنرل اسمٹس نے اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیا کہ "شمالی افریقہ کو اس وقت لاکھوں کیا کروروں پونڈ کا بھی خیال نہ کرنا چاہئے اور اس کو ہر آیندہ خطرۂ جنگ

کا مقابلہ کرنے کے لئے خود طیار ہونا چاہئے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی غیر آئے گا اور اس پکے ہوئے پھل کو ہضم کر جائے گا۔ چنانچہ مسٹر پیرو اسوقت انگلستان میں اسلحہ خرید رہے ہیں اور افریقہ بھیج رہے ہیں۔

یہی حال آسٹریلیا کا ہے۔ وہاں بھی فوج کی تعداد ستر ہزار کی جارہی ہے (حالانکہ وہاں کی کل آبادی ستر لاکھ ہے) ۵۰ بمبار جہاز امریکہ سے طلب کئے جارہے ہیں۔ صناعتی مرکزوں کی حفاظت کے لئے مخصوص فوجی دستے مرتب ہو رہے ہیں، پلوں، کارخانوں اور خاص خاص مقامات کے تحفظ کے لئے انتظامات جاری ہیں، عورتوں کے دستے بھی طیار ہو رہے ہیں اور زہریلی گیس سے بچنے کے طریقے بھی اختیار کئے جارہے ہیں۔

ہندوستان یا فلسطین میں بھی مزید چھ ڈویژن (۷۵۰۰۰ سپاہیوں کی جمعیت) کا اضافہ زیر غور ہے اور غالباً اسی بنا پر کہ جنگ کے وقت آسٹریلیا وغیرہ سے کسی مدد کی توقع نہیں کی جاتی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ چھ ڈویژن اطالوی سیلاب کا مقابلہ کر سکیں گے؟

برطانوی قوت پر بھروسہ نہ کرنے کے دو بڑے سبب ہیں، ایک تو یہ کہ برطانیہ فی الحقیقت اب ہندوستان کی مدد کر ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ وہ الجھنیں جو خود انگلستان سے متعلق ہیں اور جن کو موجودہ مغربی سیاسیات نے بہت زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ ہندوستان ایسے دور دراز ملک کی طرف پوری توجہ کر سکے دوسرے یہ کہ اب جنگ کی کامیابی کا انحصار پیشہ ور یا ملازم سپاہیوں پر نہیں ہو سکتا، اب ضرورت ہے کہ ہر ملک مسلح ہو اور اس کا ہر فرد ضرورت کے وقت عسکری خدمات انجام دے سکے۔ گھر کی حفاظت کا جذبہ جیسا خود گھر والے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، نوکر کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا، انگریز سپاہی ہندوستان کی سرزمین میں ہندوستان کے بچانے کے لئے کبھی اس جوش سے نہیں لڑ سکتا جو ہندوستانی سپاہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر واقعی ہندوستان زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ انگلستان کی مدد پر بھروسہ کر کے خاموش بیٹھ رہا جائے، بلکہ خود اس کو اپنی فوجی تنظیم بالکل جدید اصول پر کرنا چاہئے جس کی تفصیل ہم آیندہ اشاعت میں بیان کریں گے۔

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۳۲ء - نومبر ۳۳ء - جنوری و اپریل تا ستمبر - نومبر و دسمبر ۳۴ء - جون ۳۵ء مئی و اگست ۳۶ء - فروری - دسمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو اطلاع دیں۔

منیجر نگار - لکھنؤ

مکتوبات نیاز

گرامی جناب ، والانامہ کل شام کی ڈاک سے ملا۔ وقت نہ تھا ورنہ اسی وقت جواب دیتا، آج صبح سے اس فکر میں ہوں کہ میاں صاحب کے آستانہ تک پہونچنے کی کیا تدبیر اختیار کروں۔ آپ کہیں گے اس میں تدبیر کی کیا ضرورت ہے۔ بارگاہ میں اطلاع کرائی اور جا کر قدمبوس ہو گئے۔ بالکل درست، لیکن اس گستاخی کی ہمت کیونکر پیدا کروں۔ میری ہر ہر سانس آلودۂ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ مریم پناہ! اگر انھوں نے برہم ہو کر کوئی بددعا دیدی (گو اس کا امکان کم ہے) تو سمجھئے پانی سر سے گزر گیا اور اگر دعا دی (جس کا امکان زیادہ ہے) تو نمازیں پڑھتے پڑھتے مر گیا، چلئے، جنتی ہوئی۔ ان کے ساتھ آپ کی عقیدت کے جو اسباب بھی ہوں مجھے معلوم نہیں، لیکن میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ صوفی بھی ہیں اور شمس العلما بھی۔ دُنیا کو ایک صوفی ہی سے پناہ نہیں مل سکتی، چہ جائیکہ وہ شمس العلما بھی ہو۔ سانپ اور وہ بھی کالا! معاذاللہ!

نہ بد رجستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت

بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ وہاں حاضری دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ میں ان کے آداب سے ناآشنا، وہ میری آزادہ روی سے ناواقف۔ وہ حافظ کے ساغر مے کو بھی جام کوثر سمجھنے والے، میں کوثر و سلسبیل سے بھی جواز بادہ کی تاویل کرنے والا، میرا اُن کا کیا میل!

کچھ عرصہ ہوا اُن کے ایک اور معتقد مجھ سے آکر ملے اور دیر تک مدح سرائی کے بعد کہنے لگے کہ صرف میاں صاحب کی دُعا سے میرا تبادلہ ایک دوسرے دفتر میں ترقی کے ساتھ ہو گیا ہے، میں سُنکر خاموش ہو رہا، لیکن تکلیف بہت ہوئی۔ اتفاق دیکھئے کہ دوسرے ہی دن وہ اپنی اصلی جگہ پر واپس کر دئے گئے، میں نے اُن سے سبب دریافت کیا تو دبی زبان سے کہا کسی وجہ سے میاں صاحب ناخوش ہو گئے تھے۔ پھر بتائیے کہ جس شخص کا "غمزۂ ناہید" اس طرح دفعتاً "قہر مریخ" میں بدل جائے۔ ایسے "قہرمان تقدس" کے پاس جانے کی کیا صورت ہے۔

میں بصد ادب معافی چاہتا ہوں۔

قبلۂ آرزوے من مقصد جستجوے من -

گرامی نامہ پہونچا - اس دل پُرسی کا شکریہ کیونکر ادا کروں - وہ الفاظ کہاں ڈھونڈھوں جو میرے جذبات کے آئینہ دار ہوں - خاموشی کی بلاغت کا قایل ہوں، لیکن "یہ حوصلۂ ضبط کہاں سے لاؤں"۔

میں اچھا ہوں اگر مطلق زندگی کو "اچھا" کہہ سکتے ہیں لیکن روح جس دور سے گزر رہی ہے وہ یہ ہے :-

برطاق گزار خواہ در خاک افگن

ما شیشۂ سرنگونِ مے ریختہ ایم

حالانکہ یہ بھی غلط ہے - یہاں شیشے میں تھا ہی کیا کہ خالی کیا جاتا - اس لئے سوال یاس و نا اُمیدی کا نہیں بلکہ نا اہلیت و عدم استحقاق کا ہے - امید کے اسباب ہی نہیں تو نا امیدی کیسی -

اس سے زیادہ خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کچھ زمانہ آپ کی معیت میں بسر ہو -

اے خوشا دقتے کہ صرفِ راہِ استغنا شود

لیکن ایسے وصل سے احتراز ہی اچھا جو "تابِ ہجوری" چھین لے، آنے کو تو آپ کے پاس آجاؤں، لیکن واپس آکر کیا حال ہوگا - اس کا خیال بھی جانگداز ہے -

میرے لئے یہ احساس کیا کم فخر ہے کہ

ہر کہ رو سوئے تو دارد بجہاں قبلہ ماست

دنیا میں آپ کا کہلاتا ہوں اور ساری دنیا اپنے آپ میں پاتا ہوں - اس سے زیادہ اور کیا چاہئے -

ایام دولت مستدام !

مکرمی -

کچھ نہ پوچھئے کہ یہ خبر سنکر دل کی کیا حالت ہوئی -

خورشید خرامید و فروغے بنظر ماند

مرحوم کی صحت پر بھی دنیا رشک کرتی تھی اور اب ان کی موت پر بھی رشک کرے گی - مجھے کیا میں سمجھتا ہوں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ ضغطۂ قلب میں مبتلا ہیں - وہ خود تو یقیناً جانتے ہوں گے، لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے کبھی اس کی شکایت نہیں سُنی - وہ موت کی آغوش ہر وقت کھُلی ہوئی دیکھتے تھے، لیکن حرکت و عمل کا یہ عالم تھا گویا کبھی مرنا ہی نہیں -

آخری وقت اُن سے یہیں لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، وہی کس بل، وہی عزم و ارادہ، وہی اضطراب کار،

وہی جذبۂ اقدام - ہنسکر پوچھنے لگے "آج کل کیا کر رہے ہو" میں نے کہا "کچھ نہ کر سکنے کے احساس کو تیز تر کر رہا ہوں" کہنے لگے "یہ تو بُری بات ہے" میں نے عرض کیا کہ "ایسی اچھی بات ہے کہ جواب نہیں" - ہنس پڑے - پھر دیر تک اپنی جدید تصنیف کا ذکر کرتے رہے - حقیقت یہ ہے کہ بڑے بلند انسان تھے، آپ کی دعائے مغفرت سے زیادہ بلند -

---

بندگان عالی - مثنوی مولانا روم کے متعلق میری رائے آپ سے کیا ساری دنیا سے مختلف ہے - نظم و زبان کے لحاظ سے اس کا کوئی پایہ نہیں اور معنوی حیثیت سے بھی مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی - کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق کا درس دینا بڑی پرانی چیز ہے اور ہر قوم کے لٹریچر میں اس کا وجود پایا جاتا ہے، لیکن وہ کتابیں جو کہانیوں کو حقیقت کے رنگ میں پیش کرتی ہیں میرے نزدیک سخت مضرت رساں ہیں اور انھیں میں سے ایک مثنوی مولانا روم بھی ہے آپ دیکھیں گے کہ جتنی حکایتیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں انھوں نے عوام کیا بعض خواص کی نگاہوں میں تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے اور اس طرح ہمیں واہمہ پرست بنانے میں اس کتاب نے بھی بڑی مدد کی ہے -

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں جن روایات و احادیث سے استناد کیا گیا ہے وہ بھی سب کی سب موضوع و ضعیف ہیں اور ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جب تک صنمیاتی رنگ نہ پیدا کیا جاتا جاہلوں کے لئے اس میں دلچسپی پیدا نہ ہوتی لیکن کیا دلچسپی "افادیت" سے زیادہ مہتم بالشان چیز ہے - بہر نوع میری رائے میں یہ یکسر تخریبی لٹریچر ہے اور اس کا مطالعہ کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا -

رہ گیا تصوف، سو اس میں شک نہیں کہ وہ اس رنگ سے خالی نہیں، لیکن ایک (Ideal) چیز ہونے میں مجھے بہت شک ہے کیونکہ اس میں نہ خیال کی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی گیرائی - اگر اس میں تاریخی ہستیوں کے متعلق غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا، بلکہ بلا تخصیص افراد و اوقات عمومی طور پر محض مثالی انداز سے حکایتیں بیان کر دی جاتیں تو اس زہر کا نقصان بہت کم ہو جاتا - لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ ادبی خصوصیات کے لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے اور نہ معنوی خوبیوں کی حیثیت سے - سعدی کو میں ان سے بہت بلند سمجھتا ہوں اور عطار کو ان سے زیادہ دلچسپ - اور سچ پوچھئے تو مجھے عراقی بھی ان سے بہتر نظر آتا ہے -

زبان و خیال دونوں کی تکمیل اگر آپ کو دیکھنا ہے تو بیدل کی حکایتیں پڑھئے :-

ایک شخص نے کسی سنسان مزار پر شمع و پروانہ کو دیکھا، پروانہ کی حالت شمع کے گرد یہ تھی :-

کہ می گشت بیتاب گرد سرش   پر افشاں تراز دود بال و پرش

ز بس پیکرش جابجا سوخته — ز خود هم چراغانے اندوخته
ز هر عضو بوسیده اعضائے شمع — سراپاش داغ و سراپائے شمع

پروانہ کی یہ بیتابی، یہ سوزانی دیکھ کر اس شخص نے پوچھا:-

نیائی چرا جانب انجمن — کہ فرش است صد رنگ و شمع و لگن
ز هر گوشه گل کرده باغ دگر — ز هر جام تابان چراغ دگر
نظر تا کنی عرض نقش است و مے — نفس تا کشی حرف چنگ است و نے
چراغے کہ سوزد بہ ویرانها — وبال است بر بال پروانها

اس کا جواب پروانہ نے جس انداز سے دیا وہ بھی ملاحظہ ہو:-

برافشاند پروانۂ بیقرار — برون ریخت از پرده مشتے شرار
کہ پروانہ را کار با جمع نیست — مرادے جز اندیشۂ شمع نیست
بہر جا چراغے برافروختند — دو عالم بہ چشم ترش سوختند
محال است بیطاقت سوختن — کند فرق ویرانہ از انجمن
بہ ویرانہ گر مدعا حاصل است — کرا ذوق آرایش محفل است

مولانا روم کے کلام میں بیخودی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن (Climax) اس میں بھی نہیں ہے۔ بیدل کے سے ٹکڑے اس کے یہاں کہاں؟

جی ہاں وہ حج سے واپس آ گئے ہیں اور اچھے ہیں۔ میں بھی ملنے گیا تھا، صورت تو ان کی بہت بدل گئی، گو سیرت کا حال معلوم نہیں لیکن سنا ہے کہ اپنے نام کے ساتھ حاجی نہیں بلکہ الحاج کا اضافہ پسند فرماتے ہیں۔

آپ کے لئے کچھ تحایف تو ضرور لائے ہیں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ علاوہ آب زمزم اور خاک شفا کے کوئی کام کی چیز بھی ان میں شامل ہے یا نہیں؟

میں نے وہاں کی سیاسیات کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ خالص حج کرنے گئے تھے اور جو چشم حقیقت انھوں نے کراچی کے ساحل پہ کھولی تھی، وہ وہاں بھی بدستور کھلی رہی۔
اللہ، اللہ، کیا مرتبے ہیں۔ سچ ہے

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

بندہ نواز - جس بحث کو آپ نے اُٹھایا ہے، خدا کرے، اس کا انجام بخیر ہو، لیکن مجھے امید نہیں۔ سب سے پہلی اُصولی غلطی تو یہ ہی ہوئی ہے کہ آپ نے اپنی حجت کی بنیاد "لااکراہ فی الدین" پر قایم کی ہے، حالانکہ اسکے جو معنے آپ نے بتائے ہیں اس کی تردید تاریخ کے متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے اس کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں کہ " دین میں اکراہ پیدا ہوتے ہی دین غائب ہو جاتا ہے"

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا مذہب تشدد سے نہیں پھیلا آجتک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ قرون اولیٰ میں کسی شخص نے اسلام اختیار ہی نہیں کیا۔ کیا واقعات جنگ و حرب کو آپ جھٹلا سکتے ہیں اور کیا ان کا مقصود اشاعتِ مذہب نہ تھا؟ میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ مسلمانوں کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں اور انھوں نے جارحانہ اقدام کبھی نہیں کیا۔

بہرحال یہ استدلال بہت بوسیدہ ہے اور تاریخی حقایق کے مقابلہ میں اس کو پیش کرنا اپنی کمزوری کی اور تشہیر ہے۔

خانصاحب ، دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

یعنی نہ غالب کے پرزے اُڑے، نہ پرزے اُڑانے کی کسی نے کوشش کی۔ میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس قوم میں اب کوئی جراٴت باقی نہیں رہی۔ اور جب ایک قوم پست ہمتی کی اس منزل پر پہونچ جاتی ہے، تو اس کا اُبھرنا محال ہوتا ہے۔ ابھی نہیں اگر آپ زندہ رہے (میں تو خیر نہ رہوں گا) تو آیندہ دیکھیں گے اس کا کیا حشر ہوا۔ زمانہ اور اس کے اُصول وہی ہیں، لیکن ہم وہ نہیں ہیں۔

گل ہمہ گوش ست لیکن صوتِ بلبل نارساست نالہا کوتاہ افتادست جُرم گوش نیست

گلہائے جعفری

جیبی سائز پر تقریباً ۱۵۰ اشعار جسے جناب نیاز صاحب نے ڈپٹی جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے کلام سے انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب میں آپ کو ایسے اشعار بھی ملیں گے جن میں میر کا سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے اور غالب کی رنگینی و شوخی بھی جو جناب اثر کا خاص رنگ ہے۔ ۵ ر کے ٹکٹ بھیجکر آپ حاصل کر سکتے ہیں۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب سید ہادی مرتضیٰ صاحب - مراد آباد)

گزشتہ ماہ کے نگار میں کسی صاحب کے استفسار پر آپ نے مومن کے بعض اشعار کا مطلب تحریر فرمایا ہے۔ میری رائے میں یہ سلسلہ بہت مفید ہے، کیونکہ مومن کہیں کہیں غالب سے زیادہ دقت پسند ہوگیا ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے ایسے اشعار کو واضح کیا جائے۔ میں آج ذیل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ براہ کرم ان پر توجہ فرمایئے :-

۱- حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اُس کو — دیکھنا خانۂ آئینہ بھی ویراں ہوگا
۲- دیدۂ منتظر آتا نہیں تجھ تک شاید — کہ مرے خواب کا بھی کوئی نگہباں ہوگا
۳- آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا — مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا
۴- مجمع بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا — طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا
۵- چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے — پردۂ شوخ جو پیوندِ گریباں ہوگا
۶- رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا
۷- سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے — مرگ نے کب وعدہ فردا کیا
۸- حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں — بتخانے ہی سے کیوں یہ بد انجام نکلتا
۹- ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آکے مری نعش پہ وہ رو گیا
۱۰- میں بولوں تو چپ ہوتے ہیں اب آپ بھی نہ کہ — یہ رنجشِ بیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

۱۱- کیا کہئے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ — سُن سُن کے وہ چپکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

۱۲- مدعا غیر سے کہتا تھا وہ — سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا

۱۳- تو فلک مرگ ہم سے سب غافل — اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

۱۴- بات شب کو اس سے منع بیقراری پر بڑھی — ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

۱۵- بل بے عیاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن — وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

۱۶- آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر — وقت بارش اخگر خورشید تف ہر ژالہ تھا

۱۷- اس لب نازک کو برگ گل سے دیتے ہیں مثال — ہونٹ برگ لالہ تھے اور نیل داغ لالہ تھا

(نگار) ۱- "اس کو" سے مراد محبوب ہے۔ یعنی اگر آئینہ میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر خود اپنے حُسن پر دیوانہ ہو گیا جو یقینی بات ہے تو خانۂ آئینہ ویران ہو جائے گا یعنی آئینہ دیکھنا چھوڑ دے گا۔ ظاہر ہے کہ دیوانگی کی حالت میں جب آرائش و زیبائش کا خیال باقی نہیں رہتا تو آئینہ لیکر کون بیٹھتا ہے۔ ضمناً یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ آئینہ کی رونق اسی کے حُسن ہی کی وجہ سے ہے اگر اس کے حُسن کا انعکاس نہ ہو تو وہ خانۂ ویران ہے۔

۲- "دیدۂ منتظر" منادی ہے یعنی اے دیدۂ منتظر، تجھ تک خواب نہیں آتا، شاید خواب کا بھی کوئی نگہبان ہوگا جو اسے آنے نہیں دیتا۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب تک محبوب نہ آئے نیند آنا محال ہے۔ اُدھر محبوب کا نگہبان محبوب کو نہیں آنے دیتا اور ادھر خواب کا نگہبان خواب کو نہیں آنے دیتا۔

۳- محرومی اور امید بظاہر ایک دوسرے کی منافی ہیں لیکن شاعر کہتا ہے کہ محرومی کا علاج بھی امیدی ہے چنانچہ شب ہجراں میں جیتے رہنا بھی صرف موت کی امید پر ہوگا۔ یعنی اگر موت کی امید نہ ہوتی تو شاید شب ہجراں نہ کٹتی اور اس طرح محرومی کا علاج امید ہی قرار پایا۔

۴- شب غم میں وہ زمانہ یاد آگیا جب ایک ہی بستر مخمل پر ہم اور وہ دونوں جمع تھے اور اس یاد کی وجہ سے خفتہ طالعی یا محرومی کا زمانہ اور زیادہ تلخ ہو گیا۔

دوسرے مصرعہ میں لفظ خواب محض اس لئے لایا گیا ہے کہ پہلے مصرعہ میں لفظ مخمل موجود ہے۔ "خواب مخمل" مخمل کے رونگٹے کو کہتے ہیں۔

۵- اس شعر میں اُلجھن "پردۂ شوخ" سے پیدا ہوتی ہے، یہ ترکیب صفت موصوف کی نہیں بلکہ مضاف و مضاف الیہ کی ہے۔ یعنی اس شوخ کا نقاب یا اس شوخ کے در کا پردہ۔ مدعا یہ کہ اگر ہمارے پھٹے ہوئے گریبان میں ہماری تسلی کے لئے اس شوخ کے در کا پردہ پیوند کر دیا گیا تو ہم اور بھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے کیونکہ ہم

اس کے پردہ ہی کے تو مارے ہوئے ہیں۔

۶- پہلے مصرعہ میں "رحم فلک" مضاف و مضاف الیہ ہے۔ اس مصرعہ کو استعجاب کے لہجہ میں پڑھئے اس طرح

رحم فلک اور مرے حال پر!

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے ستم آرا تیرا ستم کرنا ہی میرے حال پر کرم تھا کہ اب فلک کو بھی مجھ پر رحم آنے لگا ہے۔

۷- آپ نے جو وعدہ ملنے کا کیا ہے وہ سچ سہی، لیکن موت نے تو وعدۂ فردا نہیں کیا، ممکن ہے وہ آج ہی آجائے اسی وقت آجائے۔ اسی مضمون کو میر نے اس طرح ادا کیا۔

تیرے ایفائے عہد تک نہ جئے

عمر نے ہم سے بیوفائی کی

۸- اس شعر کی نثر یوں ہوگی:- مومن کے نصیبوں میں حوریں نہیں۔ جو ہوتیں۔ (تو) یہ بد انجام بتخانے ہی سے کیوں نکلتا۔

۹- شرعاً رونے والے کو جنازہ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے کہ اس کا جنازہ پر آکر رونا محبت و ہمدردی کی بناء پر نہ تھا بلکہ بہانہ تھا اس بات کا کہ جنازہ کے ساتھ جانے کی تکلیف گوارا نہ کرنا پڑے۔

۱۰- اس شعر کی نثر یوں ہوگی:-

میں (اگر) بولوں تو آپ ابھی چپ ہوتے ہیں، یہ رنجشِ بیجا جبھی تک ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا۔

۱۱- جب اغیار کا شکوہ اُس سے کرتا ہوں تو وہ ایسا چپ ہو جاتا ہے کہ بس کچھ کہا نہیں جاتا۔ یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی ہے۔ اغیار کا شکوہ۔ دھوکے میں ڈالنے والا فقرہ ہے۔ اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ "وہ شکوہ جو اغیار نے کیا"۔ لیکن یہاں مراد "شکوہ اغیار کے خلاف" ہے۔

۱۲- میں نے اپنا مدعا دشمن سے کہدیا تاکہ وہ (یعنی محبوب) یہ سمجھ لے کہ اب یہ مدعا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اس لئے اس کی مخالفت بیکار ہے۔

۱۳- اس شعر میں کیا اشکال ہے۔ پہلا مصرعہ یوں لکھئے:-

تو - فلک - مرگ، ہم سے سب غافل

۱۴- رات ہم بیقرار تھے تو اس نے بیقراری سے باز رکھا اور کہا کہ اتنی بیقراری کیوں ہے، ہم اسے التفات سمجھکر اور بیقرار ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ بات بڑھ گئی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اس کا بیقراری سے باز رکھنا بر بنائے ہمدردی تھا حالانکہ یہ سب کچھ خفگی کی بناء پر تھا اور اس ناسمجھی سے بات بڑھ گئی۔

۱۵- اس شعر میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ "وہ وعدۂ وصل کس سے کرتا تھا" اگر عدو مراد لیا جائے تو عیاری کا لفظ بیکار ہو جاتا اس لئے وعدۂ وصل مومن ہی سے کر رہا تھا کہ ایک طرف دشمن کو یہ یقین دلایا کہ وہ مومن سے وعدۂ وصل کرکے شرمندہ ہے اور دوسری طرف مومن کو یہ تسلی دی کہ پچھلا وعدہ کرکے پورا نکرنے پر اسے بڑا حجاب ہے۔

۱۶- اس شعر میں کوئی اشکال نہیں۔ غالباً دوسرے مصرعہ کی فارسی ترکیب نے الجھن پیدا کی ہے۔ اس کو یوں پڑھئے :- وقتِ بارش، اخگرِ خورشید تف، ہر ژالہ تھا۔ خورشید تف صفت ہے اخگر کی، یعنی سورج کی سی گرمی رکھنے والا اخگر۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ "تم نہ تھے تو بارش نے اور یہاں آگ لگا دی یہاں تک کہ ہر ہر ژالہ ایک "اخگرِ خورشید تف" کا حکم رکھتا تھا۔

۱۷- پہلے مصرعہ میں "ہیں" صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ "ہی" ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہوا کہ لب نازک کو برگ گل سے مثال دیتے ہی معشوق نے غصہ سے ہونٹ چبانا شروع کئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہونٹ برگ لالہ بن گئے اور ان پر جو نیل پڑا تھا وہ داغ لالہ معلوم ہونے لگا۔ مدعا یہ کہ محبوب کے لبوں کو برگ گل کہنا ان کی توہین ہے۔

جرجی زیدان

(جناب سید عبدالحیٔ صاحب۔ حیدرآباد)

مصر کے مشہور مصنف و مورخ جرجی زیدان کے حالات مطلوب ہیں۔ براہ کرم مختصراً قلمبند فرماکر ممنون کیجئے۔

(نگار) جرجی زیدان ۱۴ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بمقام بیروت پیدا ہوا اور ۲۱ اگست ۱۹۱۴ء کو قاہرہ میں انتقال کیا۔

یہ ایک غریب مسیحی خاندان میں پیدا ہوا تھا اور ابتدائی تعلیم اس کی باقاعدہ نہ ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ خود اس کی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا۔ کچھ دنوں تک اس نے پروٹسٹنٹ کالج میں تعلیم پائی اور وہاں سے دواسازی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد یہ مصر چلا گیا اور ایک سال اخبار الزمان کے ادارہ میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۸۴ء میں ایک ترجمان کی حیثیت سے سوڈان گیا اور وہاں سے بیروت واپس آکر ۱۸۸۶ء میں لندن گیا یہاں کچھ دن قیام کرکے مستقلاً قاہرہ میں مقیم ہو گیا۔ یہاں کچھ دن معلمی کی اور پھر کئی سال تک المقتطف (عربی رسالہ) کے دفتر میں ملازم رہا۔

اس نے اپنی سب سے پہلی تصنیف "فلسفۂ لسان" پر سنہ ۸۶ء میں شایع کی۔ اس کے بعد سنہ ۸۹ء میں موجودہ مصر کی تاریخ دو جلدوں میں شایع کی اور چند کتابیں نصاب کی بھی لکھیں لیکن ان میں زیادہ کامیابی اسے حاصل نہیں ہوئی۔

سنہ ۹۱ء میں اس کا سب سے پہلا تاریخی ناول "آخرین مملوک" شایع ہوا اور سنہ ۹۲ء میں اس نے اپنا مشہور رسالہ الہلال جاری کیا اور ہر سال ایک تاریخی ناول شایع کیا۔ اس کے ان ناولوں کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی اور الہلال کی اشاعت بھی بہت وسیع ہو گئی۔ اس کے ۲۲ ناولوں میں سے سترہ ایسے ہیں جن میں عربوں کی ابتدائی فتوحات سے لیکر مملوکوں کے زمانے تک اسلامی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ باقی تین ناول میں اٹھارہیں اور انیسویں صدی کے واقعات سے بحث کی ہے۔ یہ ناول بہت مقبول ہوئے اور مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔

اس کی تاریخی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت "تاریخ التمدن الاسلامی" کو حاصل ہوئی۔ اسکی پانچ جلدیں ہیں اور زمانۂ تالیف سنہ ۱۹۰۲ء اور سنہ ۱۹۰۶ء کے درمیان ہے اس تاریخ کی بنیاد زیادہ تر مغربی مستشرقین کی تاریخیں ہیں اور اسی لئے اس میں کافی نقایص موجود ہیں۔ امین المدنی، یوسف طلبشی اور مولانا شبلی مرحوم نے انتقادی رسایل اس کی تصانیف پر عربی میں شایع کئے۔

اس نے ایک کتاب تاریخ ادب عرب پر بھی شایع کی اور یہی غالباً اس کی سب سے پہلی تالیف تھی جو مغربی اصول پر لکھی گئی۔ زیدان کی کتابوں میں کوئی خاص ریسرچ نہیں پائی جاتی تاہم اس کے بیان کی سلاست ایسی خصوصیت تھی جس نے اس کی تصانیف کو بہت مقبول بنا دیا۔ ہر چند بعض قدامت پرست علماء نے اس کی زبان میں بھی غلطیاں نکالی ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس نے ایک خاص اسٹایل لکھنے کا پیدا کیا اور اس دور کی عربی انشا پردازی کی تاریخ میں اس کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

اس کے بعض مضامین کے مجموعے "مختارات" کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔

فلسفۂ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت عہ رعایتی ۱۲ر محصول علاوہ۔

منیجر نگار بک ایجنسی لکھنؤ

کیا آپ کو معلوم ہے

سمندر کا پانی نمکین کیوں ہے؟

سمندر کا پانی فی الحقیقت وہ بارش ہے جو خشکی پر ہوتی ہے۔ مینہ زمین اور مسام رکھنے والی چٹانوں میں جذب ہو کر کیمیاوی اجزاء کو (جو ان کے اندر پائے جاتے ہیں) گھلا دیتا ہے اور پھر یہاں سے وہ پانی ان تمام کیمیاوی اجزاء کو لئے ہوئے چشموں اور دریاؤں کی صورت اختیار کر کے سمندر میں پہونچ جاتا ہے یہی کیمیاوی اجزاء جن میں بڑا حصہ نمک کا بھی شامل ہوتا ہے، سمندر کے پانی کو شور بنا دیتے ہیں۔

مختلف سمندروں میں نمک کی مقدار مختلف ہے۔ بحر شمال اور بحر اٹلانٹک میں نمک کی مقدار تین فی صدی ہے، بحر روم میں چار فی صدی اور بحر مردہ میں ۲۰ سے ۲۵ فی صدی تک۔

زمین کی قدیم ترین چٹانوں کی عمر، نمک کی اس مقدار سے معلوم ہوتی ہے جو ان سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ زمین کی قدیم ترین چٹانوں کی عمر ۲۰ کروڑ سال کی ہے۔

فاسزم کیا ہے؟

فاسزم ایک خاص نظام حکومت کا نام ہے جسے سنہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے قایم کیا۔ یہ ایک قومی تحریک ہے جس کا مقصود اشتراکیت و اجتماعیت کو فنا کر دینا ہے۔ اس کی بنیاد قدیم رومہ کی اس تاریخ پر قایم ہے جب ملک کے ہر باشندہ کا فرض تھا کہ وہ حکومت کا وفادار خادم رہے اور نیز اس خیال پر کہ دنیا میں حکمرانی کا حق اہل رومہ ہی کو حاصل ہے۔ تجارتی انجمنوں کو توڑ کر فاسزم نے خود اپنی انجمنیں قایم کی ہیں اور نظریۂ فاسزم یہ ہے کہ حکومت نام ہے مختلف صناعتی انجمنوں کے اتحاد کا نہ کہ افراد کا۔ ان انجمنوں کی تنظیم میں مزدوروں اور سرمایہ داروں دونوں کے نمایندے شامل ہوتے ہیں اور وہی تمام اُمور کا فیصلہ کرتے ہیں۔ انھیں انجمنوں کے نمایندے حکومت میں شامل

ہوتے ہیں اور اس طرح ایک پارلیمنٹ کی صورت قایم ہو جاتی ہے -

فاسزم (Fascism) کا لفظ فیسنز (Fasces) سے ماخوذ ہے - ڈنڈوں کا ایک گٹھا جس کے بیچ میں کلہاڑی بھی ہو، فیسنز کہلاتا ہے - قدیم روم میں یہ نشانِ اقتدار سمجھا جاتا تھا جسے ایک آدمی مجسٹریٹ کے آگے آگے لیکر چلتا تھا -

سب سے زیادہ بارش کہاں ہوتی ہے؟

دنیا کا سب سے زیادہ مرطوب مقام آسام ہے جہاں گزشتہ ۴۵ سال سے سالانہ اوسط بارش ۴۵۰.۷ انچ ہے اس بارش کا ۳/۴ حصہ جون، جولائی، اگست میں ہوتا ہے اور ۱/۴ صرف جولائی میں ہو جاتا ہے -

برف سفید کیوں ہوتی ہے؟

برف مجموعہ ہے بہت سے چھوٹے چھوٹے بلوری ذرات کا جن میں ہر طرف سے روشنی کا انعکاس ہوتا ہے اور یہ انعکاس سفیدی کی جھلک پیدا کر دیتا ہے - اگر روشنی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعہ ہے سات رنگوں کا (جیسا کہ تکونے بلوری ٹکڑے کے اندر دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے) لیکن چونکہ برف کے بلوری ذرات میں روشنی کا تجزیہ نہیں ہوتا اس لئے وہ سفید معلوم ہوتی ہے -

آپ شیشے کے کسی شفاف ٹکڑے کو لیکر کچل ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شفافیت غائب ہو گئی ہے لیکن برخلاف اسکے برف کو خوب دبا کر اس کی سِل بنا لیجئے تو وہ شفاف ہو جاتا ہے اور اسکی سفیدی غائب ہو جاتی ہے -

انسان کے جسم سے کتنی گرمی پیدا ہوتی ہے؟

ایک تندرست جوان آدمی کے جسم سے فی گھنٹہ ۴۰۰ یونٹ گرمی پیدا ہوتی ہے - آپ یونٹ کے مفہوم کو دوسری طرح سمجھئے - یعنی اگر ۲۵ آدمی کسی معمولی کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوں، تو ان کے جسم سے جو گرمی پیدا ہوگی وہ اتنی ہی ہوگی جتنی ۱۴۰ ڈگری پر ۵۰ مربع فیٹ والے گرمتابہ (Radiator) سے پیدا ہوتی ہے - گرمتابہ ایک آلہ ہے جو اپنے اندر سے گرمی پیدا کر کے کمرے کو گرم کرتا ہے -

اسی لئے تھیٹروں، عکاس خانوں اور دوسری پبلک عمارتوں میں ہوا کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے تاکہ مجمع سے پیدا ہونے والی گرمی تکلیف نہ دے سکے اور دم نہ گھٹے۔

کیا ہوائی جہاز وقت سے زیادہ تیز چل سکتا ہے؟

پہلے وقت کی رفتار کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ وقت کا اندازہ آفتاب کے طلوع و غروب سے کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ زمین کی گردش سے۔ زمین کا دور ۲۴۰۰۰ میل ہے اور وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور پر ایک چکر پورا کر لیتی ہے گویا اس کی محوری گردش مغرب سے مشرق کی طرف ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ ہے اور یہی رفتار وقت کی ہوئی۔

جس وقت بحری طیارہ ۴۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگا تو بعض لوگوں نے کہا کہ "اب وقت ایک جگہ ٹھہر کر رہ گیا ہے"۔ بظاہر یہ بات بالکل شاعرانہ معلوم ہوتی ہے لیکن نہایت معمولی حساب داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر جہاز زمین کی حرکت کے خلاف مغرب سے مشرق کی طرف اسی رفتار سے چلے جو زمین کی ہے تو یقیناً وقت ٹھہرا ہوا معلوم ہوگا، یعنی آفتاب کی بلندی اس کے لئے ایک ہی ڈگری پر رہے گی۔ لیکن اگر جہاز اپنے خطِ پرواز کا زاویہ بدل کر دوری فاصلہ کو کم کر دے تو وہ صرف ۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار پر وقت سے زیادہ تیز چل سکتا ہے۔

سب سے بلند عمارت کون ہے؟

تبت کی سرحد کی طرف ریاست کشمیر کا ایک مقام ہے جسے ہانلی کہتے ہیں، یہاں ایک معبد بودھ مت والوں کا ہے جو سمندر کی سطح سے ۳ میل کی بلندی پر واقع ہے یہاں سوائے اس معبد کے اور کوئی عمارت نہیں ہے اس میں صرف سو پجاری رہتے ہیں اور یہاں سے باہر نہیں جاتے

بجلی کڑک سے پہلے کیوں ہوتی ہے؟

یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ پہلے اسے بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور پھر کڑک سنائی دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ روشنی کی لہریں آواز کی لہروں سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶۳۲۲ میل فی سکنڈ ہے اور آواز کی رفتار ۷۵۰ میل فی گھنٹہ۔ گویا ہم بجلی کی چمک کو اسی وقت دیکھ لیتے ہیں جب وہ پیدا ہوتی ہے اور آواز کو کچھ وقت گزرنے کے بعد سنتے ہیں۔ اگر آپ بجلی چمکتے ہی گھڑی لیکر شمار کریں کہ کتنی دیر میں کڑک کی آواز آئی ہے تو آپ اس فاصلہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جہاں سے یہ آواز شامل

"بدگمانی"

تازہ ترین تاثر

ہمنشیں! اہلِ جہاں کی تنگ دامانی نہ پوچھ
وہم زائیدہ جنوں کی فتنہ سامانی نہ پوچھ

کھو چکا ہے عظمتِ تقدیسِ انساں کا ضمیر
ڈھل چکا ہے وہم کے سانچے میں فطرت کا خمیر

خود تراشیدہ خیالوں پر یقیں کا ہے مدار
آدمی کا ہے تخیل بدگمانی کا شکار

بن چکے ہیں وہم کے اڈے جہاں کے دشت و کوہ
آدمی کو آدمی کے حال کی رہتی ہے ٹوہ

کھا رہے ہیں اہلِ دانش، بدگمانی کے فریب
چھُٹ چکا ہے ہاتھ سے فطرت کے دامانِ شکیب

اک ذرا سی بات کا افسانہ کر دیتے ہیں لوگ
لگ چکا ہے بدگمانی کا دلِ انساں کو روگ

ہو رہی ہے وہم کے اجزا سے تعمیرِ خیال
ساغروں میں گھُل رہا ہے بدگمانی کا گلال

اس جہاں میں وہم کی پرچھائیوں کا راج ہے
بدگمانی کا عمل، رسوائیوں کا راج ہے

اس جہاں میں پھول کی پتی کو چھو لینا گناہ
حُسن کے موضوع پر اشعار کہہ دینا گناہ

اوس کی بوندوں سے دامن کو بھگو لینا گناہ
آبشاروں کے کنارے، ہاتھ دھو لینا گناہ

چاندنی راتوں سے لذت یاب ہونا بھی گناہ
اک ذرا سی دیر کو بے تاب ہونا بھی گناہ

ایک پاکیزہ مسرت کا تصور بھی گناہ
حُسن کے عنوان پر غور و تفکر بھی گناہ

آسماں کے چاند تاروں کا نظارہ بھی گناہ
پھول کی معصوم ڈالی کا سہارا بھی گناہ

محفلِ شعر و ادب میں بار پانا بھی گناہ
شعر پڑھنا جرم اور کچھ گنگنانا بھی گناہ

انتہا یہ ہے کہ احساسِ مسرت بھی گناہ
مختصر یہ ہے کہ پاکیزہ محبت بھی گناہ

اس جہاں میں "شعرگو" بھی کسقدر ہے بدنصیب
لوگ شاعر کے "تصور" کو سمجھتے ہیں رقیب

فکرِ شاعر کو کوئی دلکش کھلونا چاہیئے
شعر کے ماحول کو رنگین ہونا چاہیئے

رنگ و بو کے گلستاں میں شعر پاتا ہے فروغ
کاش! اس پہ غور کرتا بدگمانی کا دروغ

دل کی دھڑکن شعر میں جب تک کہ ہو جائے نہ بند
مطمئن ہوتی نہیں شاعر کی طبعِ دردمند

ہے تحرک کی ضرورت دل کی دھڑکن کے لئے
چاہیئے مہمیز اس چالاک توسن کے لئے

لوگ شاعر کو سمجھتے ہیں امامِ خانقاہ
عام منظر پر نہیں آتا کبھی جس کا گناہ

لوگ شاعر کو سمجھتے ہیں فرشتے کی مثال
ایک مرکز سے کبھی ہٹتا نہیں جس کا خیال،

اس جہاں میں زندگی کا نام ہے آوارگی
ہے دماغوں پر مسلط زہد کی بیچارگی

فطرتِ شاعر پہ اور پابندیاں فریاد ہے
یہ زمانہ کس قدر نافہم اور جلاد ہے

ماہر القادری

غزل :

تصور میں جو پھولوں کا سماں ہے
قفس کی شام، صبحِ گلستاں ہے

بہت سے دہر میں قاتل ادا ہیں،
تمہیں سے کیوں زمانہ بدگماں ہے

جوانی اور پھر تیری جوانی،
ترے صدقے میں اک دنیا جواں ہے

نہ پوچھو شامِ تنہائی کا عالم
تمہاری یاد بھی دامن کشاں ہے

مرا افسانۂ پردرد ماہر،
بہ عنوانِ حدیثِ دیگراں ہے،

ماہر القادری

کلیسا

آرہی ہے دور سے گرجے کے گھنٹوں کی صدا
ٹھہر جا اے ہمنشیں اس رہگذر پر ٹھہر جا

آہ یہ قاتل ترنم آہ یہ کافر سرود
ہر نفس محو عبادت ہر نفس صرفِ سجود

مرکزِ تثلیث پر حسن و جوانی جلوہ تاب
ایک ہی سیلاب میں بہتا ہوا ہر شیخ و شاب

سیکڑوں دل اک ہجومِ شوق میں کھوئے ہوئے
سیکڑوں طوفاں کنارِ بحر میں سوئے ہوئے

سیکڑوں معصوم بچے سیکڑوں پیر و جواں
صف بہ صف پہلو بہ پہلو کارواں در کارواں

ایک ہی جا سیکڑوں دوشیزگانِ نازنیں
ایک مرکز پہ ہزاروں سیم تن زہرہ جبیں

ایک جا سمٹا ہوا سا اک جہانِ رنگ و بو
اک جگہ ٹھہرا ہوا سا کاروانِ رنگ و بو

نازنینوں کی دعائیں مہ جبینوں کے نیاز
ایک آہنگِ مقدس میں بلا کا سوز و ساز

ہاتھ میں انجیل سینوں میں مسلسل اضطراب
بہکی بہکی سی نگاہیں کھویا کھویا سا شباب

اک کلیسا میں ہزاروں آتشیں رخ بے نقاب
ایک آغوشِ تجلی میں ہزاروں آفتاب

صفحۂ انجیل پر کھوئی ہوئی سی ہر نگاہ
دامنِ تثلیث میں سوئی ہوئی سی ہر نگاہ

سیکڑوں دوشیزہ سینوں پر صلیبوں کے نشاں
اک فضائے قدس میں لاکھوں فرشتے پرفشاں

انتہائے قدس میں ڈوبی ہوئی سی ہر نظر
دامنِ مریم کا سایہ ہر سرِ معصوم پر

اک حریمِ قدس میں ہر بنتِ مریم سرنگوں
لب پہ آیاتِ مقدس آنکھ میں رنگِ فسوں

آہ یہ معصوم منظر اُف یہ لاہوتی فضا
یہ تکلم یہ ترنم یہ تقدس یہ دعا

اے کلیسا پاکیٔ دامانِ مریم کی قسم
لڑکھڑاتے ہیں ترے جادے پہ طاعت کے قدم

عبرتِ دنیا کے نظاروں میں شامل تو بھی ہے
آہ میری رہگذر کی ایک منزل تو بھی ہے

سوز بھی تیری فضائے قدس میں ہے ساز بھی
کاش اس طوفان میں سن لے تو میری آواز بھی

دفعتاً تیری طرف کھنچتا چلا آتا ہے دل
ایک طوفانِ ترنم میں بہا جاتا ہے دل

زمزمے خوابیدہ ہیں تیرے ترنم زار میں
حسن کی کلیاں چٹکتی ہیں تیرے گلزار میں
روح تھراتی ہے تیرے ہر مقدس راگ سے
دل بھڑک اُٹھتا ہے ان نغموں کی دھیمی آگ سے
جی میں آتا ہے کہ تیرا ہمنوا ہو جاؤں میں
دل یہ کہتا ہے یہیں صرفِ دعا ہو جاؤں میں
آنسوؤں کے تار سے عرضِ گرانجانی کروں،
نالہ ہائے شوق کو صرفِ پریشانی کروں
شوق کہتا ہے کہ تیرا ساز تجھ سے چھین لوں،
درد کہتا ہے تیری آواز تجھ سے چھین لوں
بسترِ رہبانیت سے راہبوں کو اب جگا
سُن پسِ دیوارِ ہستی دردِ پیہم کی صدا
درس دے انسانیت کا آدمِ بیدرد کو
یوں وقارِ زندگی رسمِ عبادت میں نہ کھو
جادۂ عشرت سے ہٹکر حالتِ انساں بھی دیکھ
آہ اے ساحل نشیں خمیازۂ طوفاں بھی دیکھ
اہرمن آباد ہیں تیرے ملائک زار میں
معصیت بکتی ہے تیرے زہد کے بازار میں
اس خراباتِ کہن کے جام و مینا توڑ دے
چھوڑ دے للّٰہ یہ بےحس عبادت چھوڑ دے
داغ دارِ سجدہ ہے صدیوں سے آدم کی جبیں
زاہدانِ دہر کے سینوں میں لیکن دل نہیں،
کس قدر ناآشنائے درد و غم ہے کائنات
یا خدا تو ہی بدل دے میرا عنوانِ حیات

(پروفیسر) منظور حسین شور (ام - اے)

غزل :-

کہتے رہے ابھی تک اپنا ہی ہم فسانا
کل داستاں ہماری دہرائیگا زمانا
رم خوردۂ جنوں کی منزل کا کیا ٹھکانا
منزل کو بھی تو ہم نے منزل کبھی نہ جانا
دیر و حرم کی حد سے آگے نکل چکے ہیں
اب ہو سکے تو روکے آ کر ہمیں زمانا
لٹتی ہے لٹتے لٹتے مدت میں اک جوانی
بنتا ہے بنتے بنتے مشکل سے اک فسانا

اے شور اب یہ میرا دستور ہو گیا ہے،
ہر کشمکش میں ہنسنا ہر غم میں مسکرانا

پروفیسر منظور حسین شور ام - اے

غزلیات :—

سکندر علی وجدؔ حیدرآبادی

پھر ترے گیت گا رہا ہوں میں   ساری دنیا پہ چھا رہا ہوں میں
ہو چکی صبح نیند کے ماتے!   کب سے جادو جگا رہا ہوں میں
دیر سے یاد آ رہی ہے تری   کیا تجھے یاد آ رہا ہوں میں؟
جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو   برق پر مسکرا رہا ہوں میں،
سن رہا ہوں صدا زمانے کی
ساتھ لے وجدؔ، آ رہا ہوں میں!

جب وہ مسرور نظر آتا ہے   ہر طرف نور نظر آتا ہے
میں تو میخوار ہوں، تو کیوں ساقی!   نشہ میں چور نظر آتا ہے
میں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں   تو بھی مجبور نظر آتا ہے
مے کے ساغر میں ترا پانی بھی   عرقِ انگور نظر آتا ہے
قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے   تو بڑی دور نظر آتا ہے
خاکساری کو چھپانے کے لئے
وجدؔ مغرور نظر آتا ہے

بھرتا نہیں ہے جی تجھے سو بار دیکھکر   بڑھتی ہے اور حسرتِ دیدار دیکھکر
صیاد کے سلوک پہ آنسو نکل پڑے   طرزِ نوائے مرغِ گرفتار دیکھکر
مایوسِ انتظار سراپا لرز گیا   اشکوں پہ نورِ صبح کے آثار دیکھکر
تقدیرِ عشق صبحِ ازل جاگ سی گئی   مجھ کو متاعِ غم کا خریدار دیکھکر
تصویرِ اہلِ درد نگاہوں میں پھر گئی
وجدِؔ حزیں کی مستیِ کردار دیکھکر

غزل:

دل تلخیِ حیات سے یوں دردمند ہے
ہنسنا کبھی کبھی کا بھی اب زہرخند ہے

صرف اپنے دردِ دل کی حقیقت کو جانچ کر
ہوتا ہے وہم سارا جہاں دردمند ہے

کیوں وحشتِ مزاج مجھے تم نے بخش دی
جب وحشتِ مزاج تمھیں ناپسند ہے

میں حسنِ دیر سے بھی ہوں زاہد! کنارہ گیر
حیرت ہے تجھ کو کعبہ میں کیا شے پسند ہے

پرواز جستجو کو بھی کوئی خبر نہیں
میرا مقام شوق کچھ اتنا بلند ہے

حسرت بہ صد گداز، تمنا بہ صد تپش
دل ہر معاملے میں سکوں ناپسند ہے

یہ رات، یہ بہار، یہ بڑھتا ہوا جنوں
ظالم! یہ کیا کہا! درِ میخانہ بند ہے

دستِ جنوں کو فرصتِ جنبش تو دے کوئی
تیری بہار میرے گریباں میں بند ہے

رکھا ہے نام اُس نے عدم اپنا سوچ کر
وہ رندِ نوجواں بھی بڑا ہوشمند ہے

عدمؔ

اشعار کاوش حیدر آبادی

نہ ملی چمن میں اماں مجھے رہ و رسمِ برق و شرار سے
مگر اب قفس میں ہوں خندہ زن رہ و رسمِ برق و شرار پر

نہ وہ فصلِ گل نہ وہ ابرِ تر نہ وہ سرخوشی نہ وہ دلکشی
کہ زمانہ اشک بہا چکا مرے دل کی حالتِ زار پر

وہ طلسمِ روئے جمال ہے وہ فسونِ حسنِ خیال ہے
میں خزاں کی لاش کو لیے چلا ہوں اُٹھا کے دوشِ بہار پر

وہ نہ جانے کون تھا ہمنشیں جو نقاب اُلٹ کے گزر گیا
کہ ہزاروں جلوے تڑپ رہے ہیں ہنوز راہ گزار پر

رشکِ بہار، دید کے قابل سہی مگر
آنچل تمھارے رُخ سے ہٹایا نہ جائے گا

افشائے رازِ عشق میں رسوائیاں سہی
ہم سے تو دل کا حال چھپایا نہ جائے گا

یہی نہیں کہ سوئے بزمِ دوست جا نہ سکا
میں آستانۂ دل پر بھی سر جھکا نہ سکا

غمِ حیات سے فرصت ملی نہ دم بھر بھی
میں دردِ دل کو سکوں آفریں بنا نہ سکا

وہ پوچھتے ہی رہے داستانِ غم، کاوش!
میں ان کو اپنا فسانہ مگر سنا نہ سکا

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مجموعۂ استفسار و جواب ۳ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو امتیاز اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی، مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی سی ہے

قیمت فی جلد تین روپیہ (سے ر) علاوہ محصول

خریداران نگار سے فی جلد ایک روپیہ کم

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول بارہ آنہ (۱۲ر)

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- مادئین کا مذہب۔

۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے دو آنہ (۲ر) کم

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ و صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے چار آنہ (۴ر) کم

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اسکو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

علاوہ محصول

خریداران نگار سے تین آنہ (۳ر) کم

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا کی تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عار)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۴۱

کمال طاقت
کمال سمجھ
کمال نوجوانی
کمال جوانمردی
کمال حوصلہ
کمال اُمنگ

KAMAL · کمال
REGD. رجسٹرڈ

خون کی افزائش کے لئے دُنیا کی بہترین دوا ہے۔ رگ و
ریشہ میں خون پہنچا کر جوش اور اُمنگ پیدا کرتی۔
اعصاب کو تقویت دے کر اعضا کو قوی اور مضبوط بناتی،
دل و دماغ کو قوت دیتی، کسل و ماندگی، سستی و کاہلی کو
دفع کر کے چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے،
غرض کہ جو قوت ایک مرد کو صحیح معنی میں مرد کہلا سکتی ہے
وہ کمال ہی کی رہین منت ہے
نشے والی اور زہریلی چیزوں سے پاک ہے

قیمت فی شیشی آٹھ روپیہ

کمال کے ملنے کا پتہ:

طیبی دواخانہ یونانی
چوک بازار اندور | ۴۶، محمد علی روڈ بمبئی ۳
تار کا پتہ شاہ اندور | ٹیلیفون نمبر ۲۴۵۰۳